طلوعِ اسلام

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

بدلِ اشتراک: ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ آٹھ روپے۔ غیر ممالک سے سالانہ ۱۴ شلنگ

کراچی — ٹیلیفون نمبر ۴۱۴۸۸

قیمت فی پرچہ: ہند و پاکستان سے ۔ بارہ آنے

خط و کتابت کا پتہ ۔ ۳۰/۱۵۱ ۔ ایل ۔ پی ۔ ای سی ۔ ایچ ۔ سوسائٹی ۔ کراچی نمبر ۲۹

جلد ۱۰	فروری ۱۹۵۷ء	نمبر ۲

فہرستِ مضامین:

لمعات		۲ ـــ ۷
جنسیات کا اثر قوموں کے کلچر پر	(محترم پرویز صاحب)	۹ ـــ ۲۴
مجلسِ اقبال		۲۵ ـــ ۳۴
قرآنی معاشرہ	(محترم عمر احمد عثمانی صاحب)	۳۵ ـــ ۴۶
وقار الملک	(محترم غلام رسول صاحب مہر)	۴۹ ـــ ۵۷
حقائق و عبر		۵۸ ـــ ۶۰
باب المراسلات		۶۱ ـــ ۶۳
مرکزی بزمِ طلوعِ اسلام		۶۴ ـــ
اسلام کی سرگذشت		۶۵ ـــ ۷۴
اشتہارات		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قرآن میں ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (۴۹/۱۰)۔ مومن سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ دیکھنے میں تو یہ تین الفاظ کا جملہ ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک ایسے عظیم انقلاب کا منشور (Manifesto) ہے جس نے انسانی تمدن و معاشرت اور تہذیب و سیاست کی عمارت کو بالکل نئی بنیاد عطا کر دی۔ دنیا نے اُخوت (بھائی ہونے) کے لئے خون کے رشتے کو بنیاد قرار دے رکھا تھا۔ یہی (خون کا) تعلق، خاندانی۔ قبائلی اور (بالآخر) قومی رشتوں کے لئے وجہِ جامعیت بنتا تھا۔ تاریخ انسانیت میں یہ اصول اتنے قدیم زمانے سے چلا آ رہا تھا کہ اسے ایک مسلّمہ یا کُلیہ کی حیثیت مل چکی تھی۔ لیکن قرآن نے آ کر اس مسلّمہ اور کُلیہ کو یکسر بدل دیا اور اس کی جگہ اعلان کر دیا کہ انسانی تعلقات کی وجہِ جامعیت، خون کا رشتہ نہیں بلکہ ایمان کا رشتہ ہے۔ ایمان کے معنی ہیں تصورات و نظریاتِ حیات۔ مسلک و منہاجِ زندگی۔ انسانی سعی و عمل کا منتہیٰ (مقصود)۔ قرآن نے یہ کہا کہ جن دو انسانوں میں ان تصورات و نظریات کا اشتراک ہو جو قرآن میں بطورِ اساسِ زندگی دیئے گئے ہیں، وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں، خواہ ان میں خون، رنگ، نسل، زبان، وطن وغیرہ میں سے کوئی چیز بھی مشترک نہ ہو؛ اور جن دو انسانوں میں یہ تصورات مشترک نہ ہوں اُن میں رشتہ اخوت نہیں ہو سکتا خواہ وہ خون کے رشتہ کے اعتبار سے حقیقی بھائی کیوں نہ ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ جو دو انسان خون کے رشتہ سے بھائی ہوں، اُن میں اگر ایمان کا اشتراک بھی ہو تو ان کے تعلقات دوہرے ہو جاتے ہیں۔ قرآن کے اس اعلان نے نسل پرستی کی شہ رگ کاٹ کر رکھ دی اور ان مفاخر کو خاک میں ملا دیا جو ذات یا قبیلہ کی نسبتوں سے وجہِ امتیاز بنتے تھے۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جسے نبی اکرمؐ نے (قرآن کی اس اصلِ عظیم کی تفسیر و تشریح میں، حجۃ الوداع کے خطبہ میں، ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مِّنْ اَمْرِ الْجَاھِلِیَّۃِ تَحْتَ قَدَمَیَّ مَوْضُوْعٌ۔ دیکھو! جاہلیت کے تمام دساتیر و تصورات میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ ایُّھَا النَّاسُ! اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ۔ وَ اِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ۔ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ۔ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ۔ اِلَّا بِالتَّقْوٰی۔ اے نوعِ انسانی! تمہیں سُن رکھنا چاہیئے کہ تمہارا رب ایک ہے۔ اور تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر۔ سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو

سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں۔ وجۂ فضیلت ہے تو بس یہ بات کہ تم میں سے کون قوانینِ خداوندی کی سب سے زیادہ نگہداشت کرتا ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ رکھو کہ ان کل مسلم اخو المسلم و ان المسلمین اخوۃ۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور اس طرح (تمام روئے زمین کے) مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس اعلانِ عظیم کے بعد حضورؐ نے مخاطبین سے پوچھا کہ کیا تم نے اسے سُن لیا ہے؟ اور جب اُنہوں نے اس کی گواہی دی (کہ انہوں نے اسے سن لیا ہے) تو آپ نے فرمایا کہ اَللّٰھُمَّ اشھد۔ اے خدا! تو بھی گواہ رہنا کہ میں نے تیرا یہ پیغامِ انقلاب آفریں، انسانوں تک پہنچا دیا ہے۔

رسول اللہؐ اس پیغامِ عظیم کو لوگوں تک پہنچا کر، اور اس کے مطابق، اس نئی بنیاد پر، ایک نظامِ اخوت قائم کر کے (جس میں خون کے رشتوں اور ان پر مبنی نسلی امتیاز کو قاطبتہً مٹا دیا گیا تھا)، دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہ پیغام اگرچہ دُنیا کے انسانوں کے لئے تھا لیکن اس کی عملی تشکیل عرب کی سرزمین میں، عربی النسل قوم میں ہوئی تھی کیونکہ وہی سرزمین، اس آسمانی انقلاب کا اولین گہوارہ اور وہی قوم اس کی اولین مخاطب تھی۔ اس طرح۔ یہ قوم، تمام نوعِ انسانی کے لئے، اس عظیم اصول کے مطابق جدید قومیت کا ماڈل بنی۔ کتنی بڑی تھی یہ سعادت جو اس قوم کے حصہ میں آئی اور کیسی خوش بخت تھی وہ سرزمین جو اس انقلاب کا اولین گہوارہ بنی۔

یہ کچھ چھٹی صدی عیسوی میں ہوا۔ اب تاریخ کے اوراق کو چودہ صدیوں آگے اُلٹئے اور اس عبرت انگیز منظر کو دیکھئے کہ اُسی سرزمین میں، وہی قوم، بڑے فخر و مسرت کے ساتھ اعلان کر رہی ہے کہ قومیت کا مدار نسل پر ہے اس لئے (باقی دنیا کے مسلمانوں کے مقابلہ میں) عربی النسل اقوام مل کر ایک قوم بنتی ہیں۔ عربی اقوام یہ اعلان کر رہی ہیں وَ قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)۔ اور خدا کا رسول، اپنے اللہ سے فریاد کر رہا ہے کہ اے میرے پروردگار! تو اس پر شاہد ہے کہ میری یہ قوم قرآن کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟ یہ عربی ممالک، نسل کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل اور اخوت کی تاسیس کے لئے اُس زمانے میں جد و جہد کر رہے ہیں، جب مغرب کی اقوام (نسل پرستی تو ایک طرف) وطنیت کی بنیادوں پر قومیت کے انسانیت سوز نتائج اور امن عامہ کے لئے تباہ کن عواقب سے تنگ آ کر، اتحاد اور جامعیت کے لئے نئی بنیادوں کی تلاش میں حیران و سرگرداں پھر رہی ہیں۔ اس وقت دُنیا میں دو بلاک ہیں۔ ایک روسی بلاک اور دوسرا (یوں سمجھئے کہ) مغربی بلاک۔ روس نے مدتوں پہلے دنیا کو نسل اور وطن کے بجائے، آئیڈیالوجی (فلسفۂ اشتراکیت) کی بنیادوں پر دعوتِ اتحاد و یگانگت دی تھی۔ اس کے جواب میں مغربی بلاک، دُنیا کو مذہب اور خدا پرستی کے تصورات کی وحدت پر باقی اقوام کو ایک مشترکہ محاذ بنانے کی دعوت دے رہی ہیں۔ دنیا تو آہستہ آہستہ، خون، نسل اور وطن کے رشتوں سے بلند ہو کر اشتراکِ تصورات و مقاصد کو وجۂ جامعیت بنانے کی فکر میں ہے (یہ الگ بات ہے کہ وہ تصورات اور مقاصد کس قسم کے ہیں) اور ہمارے عرب بھائی جنہیں آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے، یہ کہا گیا تھا کہ اخوت کا مدار ایمان (آئیڈیالوجی) کا اشتراک ہے نسل کی بنیادوں پر وحدت کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ کیا دنیا میں کسی قوم کی اس سے بڑھ کر کوئی اور بدبختی بھی ہو سکتی ہے کہ جن تباہ کن تصورات کو دنیا،

اپنے ناکام تجربات اور ہلاکت انگیز مشاہدات کے بعد' اس طرح مردود قرار دے رہی ہو، وہ قوم ان تصورات کو مژگانِ عقیدت سے اُٹھا کر اپنے سر آنکھوں پر رکھے؟ اگر ان عربی ممالک کے پاس وحی کی راہ نمائی نہ بھی ہوتی، تو بھی خالص عقل وبنیش اور تدبر و تفکر کا تقاضا یہ تھا کہ وہ نسل پرستی کی بنیادوں پر اتحاد کی کوشش کے بجائے، وحدتِ مقاصد کو وجۂ جامعیت بنانے کی کوشش کرتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے وحی کی راہ نمائی ہی کو نہیں چھوڑا۔ اس کے ساتھ ہی عقل وبصیرت اور فہم وفراست کو بھی تیاگ دیا ہے' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ اقوام عالم کے تجربات سے فائدہ اُٹھانے کے بھی قابل نہیں رہے۔

لیکن تماشا یہ ہے کہ یہ عربی ممالک، خالص غیر قرآنی بنیادوں پر اپنے اندر وحدت آفرینی کی مذموم کوشش کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دیگر مسلم ممالک سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ انہیں اسلام کا پیامبر اور "حرمین الشریفین کا خادم" ہونے کے اعتبار سے' واجب الاحترام سمجھیں اور ان کی دینی سیادت کو قبول کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں۔ (بالخصوص ہند و پاکستان کے مسلمانوں) کو عربوں سے ایک خاص عقیدت رہی ہے۔ لیکن وہ عقیدت محض جذبات کی بنا پر تھی جو اس قسم کے ٹھوس حقائق کے سامنے آجانے کے بعد کبھی باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر عرب ممالک' فی الواقعہ اسلام کے پیامبر اور قرآن کے علمبردار رہتے تو مسلمانانِ عالم کے نزدیک ان کی قیادت و سیادت مسلّم رہتی۔ اُنہوں نے قرآن کا دامن چھوڑ دیا اب اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اُنہیں "نسلی برہمن" سمجھ کر ان کی پوجا کریں، تو وہ جتنی جلدی اس خیالِ خام کو دل سے نکال دیں اتنا ہی اچھا ہے۔ برہمن تو اب اپنے دیس (ہندوستان) میں بھی نہیں پُجتا۔ چہ جائیکہ لوگ "بدیسی برہمنوں" کو پوجیں!

یہ ہے ان ممالک کی اپنی روش اور اس کے بعد آپ سوچئے کہ اگر ان لوگوں کی حقائق پر کچھ بھی نگاہ ہوتی اور یہ قرآن کی ایسی بنیادی تعلیم کو اس طرح پس پشت نہ ڈالتے۔ اور اخوتِ اسلامی کو اتحاد کی بنیاد قرار دیتے، تو آج دنیا کے نقشے پر مسلم ممالک کی کیفیت کیا ہوتی؟ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ باہمی معاملات میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی فکر میں رہتے ہیں، اور خارجی معاملات میں اگر اُنہیں اتحاد کی سوجھی ہے تو اس کی بنیاد نسل پر رکھتے ہیں۔ جس شخص کو اسلام کے بنیادی تصورات کی ذرا سی بھی واقفیت ہے وہ اس حقیقت کو خوب جانتا ہے کہ

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے

نسل پرستی کا تصور اسلام کی تعلیم کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ پھینکتا ہے۔

پھر حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ ان ممالک میں بڑے بڑے "علمائے کرام" موجود ہیں۔ جامعہ ازہر جیسی مذہبی درسگاہ بھی ہے۔ مکہ اور مدینہ، بغداد اور دمشق جیسے اسلامی مراکز بھی ہیں۔ لیکن کیا مجال جو ان تمام علاقوں میں سے کسی ایک سے بھی یہ آواز بلند ہوئی ہو کہ نسل پرستی کی بناء پر وحدت کا یہ تصور یکسر غیر اسلامی اور خالصتہً طاغوتی ہے! جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر ہماری فلاں بات غیر اسلامی ہے تو اب تک' اس کے خلاف، کسی نے آواز کیوں نہ اُٹھائی، وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ سیاست کی

مصلحت کوشیاں کس طرح اربابِ مذہب و شریعت کے لبوں پر مہرِ خاموشی لگا دیتی ہیں۔ اور یہ چیز صرف عربی ممالک تک ہی محدود نہیں۔ اس باب میں خود ہمارے ہاں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہمارے ہاں کے مختلف فرقوں کے علمائے کرام نے اس آئین کو اسلامی کہہ کر تبریک و تہنیت سے اس کا استقبال کیا ہے، جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترکہ اسمبلی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے "کتاب و سنت" کے مطابق قوانین وضع کرے۔ اور جس میں مسلمانوں کے "مسلمہ فرقوں" کے وجود کو آئینی حیثیت دیدی گئی ہے (حالانکہ قرآن فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے) یہی وہ آئین ہے جس کی اس شق کو (کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں ایک اسلامی مملکت کی مجلس قوانین ساز کے ممبر ہو سکتے ہیں) مخلوط انتخاب کے حامی اپنے مؤقف کے حق میں بطور دلیل پیش کر رہے ہیں۔ بہر حال، ہمارا کہنا یہ تھا کہ مسلم ممالک میں ہو یہ رہا ہے کہ وہاں کے اربابِ سیاست، اپنی مصلحت کوشیوں کی بنا پر، ہر قسم کے غیر اسلامی تصورات کو عملاً اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اربابِ مذہب یا تو علانیہ ان کی تائید کر رہے ہیں یا (کم از کم) خاموشی سے انہیں تقویت پہنچا رہے ہیں۔ ان حالات کا نتیجہ ہے کہ غیر مسلم کھلے بندوں کہہ رہے ہیں (اور بعض "روشن خیال" مسلمان بھی دبی زبان سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں) کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس (spent force) ہے اس میں زندگی اور عمل کے لئے نہ قوت باقی رہی ہے نہ حرارت۔

یہ وہ اعتراضات ہیں جن کا جواب لفظوں سے نہیں دیا جا سکتا۔ ان کا جواب ایک ہی تھا۔ اور وہ یہ کہ دنیا کے کسی حصہ میں، قرآن کی بنیادوں پر نظام قائم کر کے، اس کے نتائج اقوامِ عالم کے سامنے لائے جائیں تاکہ ان سے غیر مسلم اس حقیقت کا اعتراف کریں کہ اسلام فی الواقعہ ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو آج بھی زندگی بخش نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ اور وہ مسلمان جو اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو چکے ہیں، اس پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لا سکیں۔ پاکستان کا خطۂ زمین اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن یہاں ہمارے خداوندانِ سیاست اور اربابِ شریعت کے ہاتھوں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، اُس نے اِس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا۔ لیکن ہم اب بھی مایوس نہیں۔ اگر یہاں قرآنی فکر کو اس حد تک عام کر دیا جائے کہ لوگ قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنے لگ جائیں، تو اس سے امید ہو سکتی ہے کہ یہاں آئینی طور پر ایسی تبدیلی پیدا ہو جائے جس سے ہمارا نظامِ مملکت صحیح اسلامی خطوط پر متشکل ہو جائے۔

عرب نیشنلزم کی عصبیتِ جاہلیہ کا صحیح جواب عالمگیر نظامِ ربوبیت ہے جو احترامِ آدمیت کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ اس نظام کے قیام کی ذمہ دار جماعت کے افراد میں بنائے اخوت، اس نظام کی صداقت پر یقین (ایمان) ہوتا ہے، اور ان کا ذریعہ، بلا امتیاز رنگ و نسل، تمام دنیا کے انسانوں کی نشو و نما۔ یہی نظام، امنِ عالم کے قیام کا بھی کفیل ہو سکتا ہے۔ اگر عربوں کے سامنے، اپنے خون کے بجائے، قرآن ہوتا تو وہ نسلی بنیادوں پر اتحاد پیدا کرنے کے بجائے قرآن کی بنیادوں پر تمام دنیا کے مسلمانوں کی وحدت کی کوشش کرتے اور اس کے بعد دیکھتے کہ مختلف دروازوں پر جھولیاں پھیلانے کے بجائے انہیں کس طرح اقوامِ عالم کی امامت و سیادت نصیب ہو جاتی ہے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا

وَ لٰکِنَّہٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَ اتَّبَعَ ھَوٰىہُ (۷:۱۷۶) اگر وہ اپنے آپ کو خدا کے قانونِ مشیت کے تابع رکھتے تو خدا انہیں مراتب کی بلندیاں عطا کر دیتا۔ لیکن وہ اس کے بجائے اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آسمان کی بلندیوں پر پہنچنے کے بجائے زمین کی پستیوں میں جا گرے۔

کس قدر عبرتناک ہے یہ منظر اور کیسا تاسف انگیز ہے یہ انجام اس قوم کا جس نے ساری دنیا کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمانوں کی منزل دکھائی تھی!

۲۔ مسئلہ کشمیر

کشمیر کا مسئلہ، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح، قریب دس سال سے ایک ہی مقام پر گردش کر رہا ہے اور ساحلِ مقصود کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا۔ اب بھی صیانتی مجلس (سیکیورٹی کونسل) نے جو کچھ کیا ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جو برسوں پہلے ہو اتھا۔ یعنی آج سے بہت عرصہ پہلے، اسی مجلس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کشمیر میں استصواب ہونا چاہیئے۔ اس فیصلہ کو بھارت نے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اور وہاں کے اربابِ حکومت بلا خوف و خطر اور بغیر تامل و تذبذب، اپنے پروگرام کو آگے بڑھاتے چلے گئے۔ اور ہم بدستور واویلا مچاتے رہے لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اب اُسی مجلس نے پھر اپنے سابقہ فیصلہ کو دُہرا دیا ہے (کہ کشمیر کا فیصلہ استصواب سے ہونا چاہیئے)۔ جس وقت یہ سطور سپردِ قلم کی جا رہی ہیں، اس وقت تک مجلس کا آئندہ اجلاس منعقد نہیں ہوا۔ اس لئے یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ مجلس کی طرف سے اگلا قدم کیا ہوگا۔ ہمارے حلقوں سے اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ مجلس کو چاہیئے کہ استصواب کے لئے ایک آخری تاریخ متعین کرے۔ ایڈمنسٹریٹر کا تقرر ہو۔ اور اگر اس باب میں بھارت کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت ہو تو مجلس کی طرف سے "پولیس ایکشن" لیا جائے۔ اگر یہ کچھ نہیں کیا جاتا تو مجلس کا موجودہ ریزولیشن کچھ معنی نہیں رکھتا۔

سوال یہ ہے کہ اگر مجلس یہ نہ کرے تو پھر اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟ جہاں تک ہمارا گذشتہ طرزِ عمل شاہد ہے، اس کے بعد یہی نظر آتا ہے کہ ہم پھر بیانات دینے، تقریریں کرنے، نعرے لگانے اور ریزولیشن پاس کرنے میں لگ جائیں گے۔ اس کا جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اصل یہ ہے کہ مجلس اقوام ہو یا سیکورٹی کونسل، فیصلے ہر جگہ کمزور اور طاقتور کو دیکھ کر کئے جاتے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ نو دس سال سے کونسل میں پڑا سڑ رہا ہے اور ہمارے مسلسل زور دینے کے باوجود اس کے متعلق کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس لئے کہ اس مسئلہ کا تعلق ایک کمزور قوم سے ہے۔ اس کے برعکس، سوئیز کے مسئلے کو دیکھئے۔ چونکہ اس سے طاقتور اقوام کے مفاد وابستہ تھے۔ اس لئے اس میں کونسل کی مشینری بجلی کی طرح حرکت میں آ گئی۔ لہٰذا کشمیر کے مسئلہ کا حل ہمیں اپنے اندر سے مل سکتا ہے۔ باہر سے نہیں۔ جو کچھ اس وقت تک ہوا ہے، وہ ہماری اس کمزوری کا

نتیجہ ہے جو ہم نے متارکہ (cease - fire) کا فیصلہ کرتے وقت دکھائی۔ قوموں کی تاریخ میں ہوتا ہی یہ ہے کہ

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

لہٰذا، اس کے ازالہ کی اب ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر صیانتی مجلس اس باب میں فی الحقیقت مؤثر اقدامات نہیں کرتی تو ہمیں خود آگے بڑھ جانا چاہیئے۔ اس کے لئے سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم نے بھارت سے تجارتی اور ثقافتی ضمن کے جس قدر معاہدات کر رکھے ہیں، انہیں فسخ کیا جائے۔ پھر ان سے ڈپلومیٹک تعلقات منقطع کئے جائیں۔ اور اس کے بعد ان سے کہا جائے کہ چونکہ متارکہ (CEASE - FIRE) کا فیصلہ استصواب کے لئے ہوا تھا اور تم نے استصواب کا کوئی امکان نہیں رہنے دیا، اس لئے مجبوراً ہم اس معاہدہ کو بھی منسوخ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی طرف سے جو ردِ عمل ہو اس کا ہمیں مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔

اشاعت حاضرہ میں "جذبات" کے عنوان سے ایک اہم مقالہ شائع کیا جا رہا ہے۔ محترم پرویز صاحب نے اپنے سابقہ دورہ کے دوران میں، دیال سنگھ کالج، لاہور، میں اس موضوع پر ایک تقریر کی تھی جو اس قدر پسند کی گئی کہ صدر جلسہ نے وہیں اعلان کر دیا کہ پرویز صاحب اگر اس تقریر کو مرتب کر دیں تو اسے کالج کی طرف سے پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ یہ تقریر کالج والوں کو الگ بھیج دی گئی ہے اور اب طلوع اسلام میں بھی شائع کی جا رہی ہے۔ اس کا الگ پمفلٹ بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ اس تقریر کی بنیاد، سلیم کے نام ایک خط ہے جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس موضوع کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس کی عام اشاعت کی جائے۔

آیندہ اشاعت میں، محترم پرویز صاحب کی گراں قدر تقریر، مقامِ محمدیؐ (مقالہ کی صورت میں) شائع ہو رہی ہے۔

معراجِ انسانیت

از پرویز

سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائناتؐ کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔

قیمت بیس روپے

ملنے کا پتہ:۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲/۱۵۹۔ ایل پی۔ ای۔ سی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی ۲۹

اسے ضرور پڑھئے

قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے، یہ طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے کہ محترم پرویز صاحب کے اہم مضامین کو چھوٹے چھوٹے پمفلٹوں کی شکل میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ اس وقت تک حسب ذیل پمفلٹ شائع ہو چکے ہیں۔

روٹی کا مسئلہ —— علماء کون ہیں۔؟

تکذیب دین کون کرتا ہے؟ —— اطاعت رسول!

—— بادۂ زندگی ——

سابقہ ماہ کے طلوع اسلام میں

تقدیر امم!

کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا تھا۔ اسے بھی پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔

اس ماہ کے شمارہ میں

جنسیات

سے متعلق جو اہم مقالہ شائع ہوا ہے اس کا بھی پمفلٹ چھپوا لیا گیا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں تقسیم کیجئے۔

بزموں کو چاہیئے کہ ان پمفلٹوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں تقسیم کریں۔

آئندہ ماہ کے پرچہ میں

مقامِ محمدی

کے عنوان سے ایک گراں بہا اور قابل قدر مقالہ شائع ہو رہا ہے اسے بھی پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ اس کی عام اشاعت کی اشد ضرورت ہے۔ لہٰذا ابھی سے نوٹ کر لیجئے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

قوموں کے تمدن (کلچر) پر جنسیات کا اثر

SEX AND CULTURE

جب زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی، حیوانی سطح سے انسانی پیکر میں پہنچی تو وہ حیوانی زندگی کے بعض خصائص ولوازمات بھی اپنے ساتھ لائی۔ کھانا، پینا، سونا وغیرہ (جسم کا طبعی نظام) حیوان اور انسان میں مشترک ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ انسانی زندگی کی حیوانی سطح کے مظاہر ہیں۔ انہی میں افزائشِ نسل Procreation اور اس کے لئے جنسی جذبہ Sexual Instinct بھی شامل ہے۔

کھانے پینے کے معاملہ میں، حیوانات پر بعض پابندیاں فطرت کی طرف سے ازخود عاید ہوتی ہیں۔ مثلاً بکری گھاس کھاتی ہے گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے گھاس نہیں کھاتا۔ بطخ کے بچے انڈوں سے نکلتے ہی پانی کی طرف لپکتے ہیں، مرغی کے بچوں کو پانی کی طرف گھیر کر بھی لے جائیں تو وہ آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ حیوانات پر یہ پابندیاں ازخود عاید ہوتی ہیں اور وہ انہیں توڑنے کا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس، انسانی بچے کو دیکھئے۔ وہ سنکھیا کی ڈلی کو بھی اسی طرح بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح شاخِ نبات (مصری کی ڈلی) کو۔ وہ کبھی دہکتے ہوئے کوئلے کو ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے اور کبھی پانی میں ڈبکیاں لگاتا دکھائی دیتا ہے۔ اس پر فطرت کی طرف سے ازخود ایسی پابندیاں نہیں عاید ہوتیں جیسی حیوانات پر عاید ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ پابندیوں کے بغیر زندگی دوبھر ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ناممکن بھی ہو جاتی ہے اس لئے انسان پر بھی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں یا تو معاشرے کی طرف سے عاید کی جاتی ہیں اور یا مذہب کی طرف سے۔ (مذہب کے بجائے وحی کا لفظ زیادہ موزوں ہے اس لئے آئندہ صفحات میں اسے وحی ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ وحی سے مراد ہے ایسی پابندیاں جو انسانی معاشرہ کی طرف سے عاید کردہ نہ ہوں بلکہ خدا کی طرف سے عاید کردہ ہوں) معاشرہ کی طرف سے عاید کردہ پابندیوں اور وحی کی رُو سے متعین

معاشرتی پابندیاں

کردہ پابندیوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی پابندیاں بعض مصالح کی بنا پر بدلی بھی جا سکتی ہیں۔ لیکن وحی کی رُو سے عاید کردہ پابندیوں میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً معاشرہ کسی وقت فیصلہ کرتا ہے کہ لوگوں کو سڑک کے بائیں طرف چلنا چاہیئے۔ اس فیصلہ کی رُو سے (Keep to the left) سڑک کا قانون قرار پاتا ہے۔ لیکن اگر کسی وقت معاشرہ اس کی ضرورت محسوس کرے تو وہ اس قانون کو بدل کر "دائیں طرف چلو" کا قانون بھی نافذ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس جب وحی خداوندی نے کہا ہے کہ (مثلاً) لحمِ خنزیر حرام ہے تو کوئی انسان اس قانون میں ترمیم نہیں کر سکتا۔ وحی خداوندی کے ماننے والوں کو لحمِ خنزیر سے اسی طرح پرہیز کرنا ہوگا جس طرح بکری گوشت سے پرہیز کرتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ بکری ایسا اپنی مرضی سے

نہیں کرتی. لیکن انسانوں کو ایسا اپنے اختیار و ارادہ سے کرنا ہوگا۔

جنسی جذبہ پر پابندیاں

کھانے پینے کے علاوہ، جنسی جذبہ کی تسکین کے سلسلہ میں بھی حیوانات پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عاید ہوتا ہے. ایک بیل ہر روز گایوں کے گلے میں پھرتا رہتا ہے لیکن کبھی جنسی اختلاط نہیں کرتا، تا وقتیکہ اسے گائے کی طرف سے استقرارِ حمل کا طبعی تقاضا اس کی دعوت نہ دے. لیکن انسان پر اس قسم کا کوئی کنٹرول نہیں عاید کیا گیا وہ جب جی چاہے اپنے جنسی جذبہ کی تسکین کر سکتا ہے۔

حیوانات پر اس طبعی کنٹرول کے علاوہ (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) کسی قسم کا اخلاقی کنٹرول عاید نہیں کیا گیا (حیوانات کی صورت میں اخلاقیات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)، لیکن انسان پر اس ضمن میں اخلاقی پابندیاں عاید کی گئی ہیں. (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ پابندیاں معاشرہ کی طرف سے بھی عاید کی جاتی ہیں اور وحی کی رو سے بھی. معاشرتی پابندیوں پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ پابندیاں مختلف اقوام و ممالک میں مختلف نوعیتوں کی ہیں. نیز کسی ایک ہی قوم میں، مختلف زمانوں میں ان پابندیوں میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے. مثلاً انگلستان میں اگر ایک بالغ لڑکا اور لڑکی باہمی رضامندی سے (شادی کے بغیر) جنسی اختلاط کی صورت پیدا کریں تو معاشرہ کی نگاہوں میں یہ کوئی معیوب بات نہیں. نہ ہی ایسا کرنا قانوناً جرم ہے. اسی طرح اگر ایک شادی شدہ مرد یا عورت کسی اور سے جنسی تعلق پیدا کرلے تو یہ کوئی معاشرتی جرم نہیں. یہ اسی صورت میں جرم قرار پائے گا جب میاں یا بیوی کو اس پر اعتراض ہو. ان پابندیوں میں ردوبدل بھی ہوتا رہتا ہے. مثلاً اس وقت تک وہاں یہ صورت ہے کہ اگر کسی غیر شادی شدہ لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے اور بچے کا باپ اس لڑکی سے شادی نہ کرے تو وہ بچہ حرامی قرار پاتا اور سوسائٹی میں ذلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے. لیکن پچھلے دنوں وہاں ایک تحقیقاتی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ایسے تعلقات کو جائز سمجھا جائے. ان سے پیدا شدہ بچوں کو معاشرہ کا صحیح جزو قرار دیا جائے اور انہیں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھا جائے. وقس علیٰ ہذا. (اس وقت ان فیصلوں پر تنقید و تبصرہ مقصود نہیں. مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اگر معاشرہ چاہے تو اپنی عاید کردہ پابندیوں میں تبدیلی بھی کر سکتا ہے۔

وحی کی پابندیاں

اس کے برعکس اس باب میں وحی (یعنی قرآن کریم) نے بھی کچھ پابندیاں عاید کی ہیں. ان پابندیوں کا ماحصل یہ ہے کہ معروف طریقہ پر شادی کے بغیر کسی لڑکے یا لڑکی (مرد یا عورت) کو جنسی اختلاط کی قطعاً اجازت نہیں. اور شادی کے بعد نہ بیوی کسی غیر مرد سے اختلاط پیدا کر سکتی ہے. نہ میاں کسی اور عورت سے. اس قسم کا اختلاط فرد کا نہیں بلکہ معاشرہ کا جرم ہے اور اس (جرم زنا) کی سزا معاشرہ کی طرف سے دی جاتی ہے. اور ان پابندیوں میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔

مغرب کی جنسی بے باکیوں سے متاثر ہو کر، ہمارے ہاں کے نوجوان طبقہ میں بھی یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق ایک طبعی تقاضے کی تسکین یا افزائش نسل کے لئے ایک حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے اور بس اس معاملہ کو لڑکی اور لڑکے کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دینا چاہیئے. اور نکاح وغیرہ کی پابندی محض قانونی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے

ہونی چاہیئے۔ نہ کہ بالغ مرد اور عورت کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے۔ ان خیالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی (مغرب کی طرح) جنسی نوضویت (Sexual Anarchy) کی فضا عام ہوتی جارہی ہے اور وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں [یعنی عفت و عصمت (Chastity) کے مطالبہ] کو غیر فطری جکڑبندیاں قرار دیا جارہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں محض معاشرہ میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے ہیں، یا ان کا تعلق عالم انسانیت کے اجتماعی مصالح سے ہے۔ اگر ان کا مقصد محض معاشرتی نظم و ضبط ہے تو بے شک

ان پابندیوں کی مصلحت

معاشرہ کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے مصالح کے پیش نظر ان میں ردوبدل کرے لیکن اگر ان کا تعلق انسانیت کے کسی بنیادی مسئلہ سے ہے تو پھر کسی فرد یا افراد کے کسی گروپ کو اس کا حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ان پابندیوں میں تبدیلی کرکے انسانیت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچائے۔ قرآن نے جب زنا کو معاشرہ کا جرم قرار دیا ہے تو اس سے مطلب یہی ہے کہ اس کے نزدیک جنسی تعلق محض ایک انفرادی فعل نہیں بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر اجتماعی انسانیت پر پڑتا ہے۔ دوسری طرف جب اس نے کہا کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ...... هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۳/۵)، تو اس نے واضح الفاظ میں اعلان کردیا کہ عفت و عصمت کا، قوموں کی فلاح و بہبود سے گہرا تعلق ہے۔ جو قوم عصمت کی حفاظت نہیں کرتی وہ زندگی کے میدان میں فائز المرام (Prosperous) نہیں ہوسکتی۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے کی صداقت کی شہادت کیا ہے؟ جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے ان تمام دعاوی کو سچا مانتے ہیں، لیکن سوال ان لوگوں کا نہیں۔ سوال تو ان کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اس دعوے کو بطور ایمان (Faith) ماننے کے لئے تیار نہیں، ہم اس کے ثبوت میں علمی تائید اور شہادت چاہتے ہیں۔ ان لوگوں (بالخصوص ہمارے نوجوان طبقہ) کا یہ مطالبہ

قرآنی دعوے کی دلیل

ایسا نہیں جسے ہم لاحول پڑھ کر ٹھکرا دیں اور انہیں ملحد و بے دین کہہ کر تیوریاں چڑھالیں۔ قرآن اپنے ہر دعوے کی بنیاد علم و بصیرت پر رکھتا ہے اور اسے دلیل و برہان کی رو سے منواتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی قرآنی حقائق کھل کر سامنے آتے چلے جائیں گے سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ...... (۴۱/۵۳)، ہم انہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاآنکہ یہ چیز نکھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی بات یہ ہو کہ جنسی تعلقات کے متعلق جس قدر تحقیقات ہمارے زمانے میں ہوچکی ہیں وہ قرآن کے دعوے کی کس حد تک تائید کرتی ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور وقت کا نازک ترین مسئلہ۔ اس لئے اس قابل کہ اس پر بڑی توجہ اور گہری فکر سے غور و خوض کیا جائے۔

جنسیات کے متعلق ہمارے ہاں کوئی تحقیق نہیں ہوئی اس لئے اس کے نتائج کو سامنے لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ایک

غور و فکر

جنسیات ہی پر کیا موقوف ہے۔ زندگی کے اور کون سے شعبے ہیں جن کے متعلق ہمارے ہاں کوئی ریسرچ ہوئی ہو! حقیقت یہ ہے کہ جس قوم پر صدیوں سے سوچنا حرام ہوچکا ہو اور تقلید کہن زندگی کی محور و دش قرار پاچکی ہو، ان میں فکری

صلاحیتیں بہت کم باقی رہ جاتی ہیں۔ لہذا ہمیں اس مقصد کے لئے بھی مغرب کے محققین کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔ یورپ میں (دیگر شعبوں

علمائے مغرب کی تحقیقات

کی طرح) جنسیات نے بھی ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے لئے وہاں تحقیقاتی ادارے قائم ہیں۔ علمائے عمرانیات sociologists تہذیب کے مورخ، علمائے جنسیات اور ماہرین علم تجزیہ نفس Psycho-Analysts) وغیرہم نے اس موضوع پر کافی چھان بین کی ہے۔ اور جنسیات سے متعلق لٹریچر خاصی مقدار میں شائع ہو چکا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کی تحقیقات کا بالعموم انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے قدیم باشندوں (Primitive Tribes) کے احوال وکوائف، بودوباند، رسوم ومعاشرت اور اجتماعی اعمال ومعتقدات کا مطالعہ کرتے اور اس طرح حاصل کردہ مسالہ (DATA) سے نتائج مستنبط کرتے ہیں[1]۔ اس مقصد کے لئے انہیں جن صبر آزما اور مشقت طلب مراحل سے گذرنا پڑتا ہے اس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر افریقہ کے صحراؤں، جنوبی امریکہ کے جنگلوں، قطبین کے برفانی میدانوں اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں گذار دی۔ وہ وہاں کے وحشی قبائل میں جا کر رہے۔ انہی کی معاشرت اختیار کی۔ وہی کچھ کھایا جو وہ کھاتے تھے۔ وہی کچھ پہنا جو کچھ وہ پہنتے تھے۔ انہی کے ساتھ کبھی درختوں کے کھوکھلے تنوں میں، کبھی ان کی شاخوں کے اوپر۔ کبھی پہاڑوں کے غاروں میں اور کبھی درندوں کے بھٹوں میں زندگی بسر کی۔ بعض اوقات انہی میں شادیاں بھی کیں اور اس طرح انہی میں گھل مل کر ان کی معاشرت اور معتقدات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس طرح ان کے متعلق براہ راست معلومات بہم پہنچائیں۔ ان محققین نے دنیا کے قبائل کی معاشرت اور معتقدات کے مطالعہ کے بعد جن موضوعات کے متعلق اصول متعین کئے ہیں۔ ان میں جنسیات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مرتب کردہ نتائج ہمیں اس حقیقت تک پہنچاتے ہیں کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا معاملہ محض شہوانی جذبہ کی تسکین تک محدود نہیں ہوتا۔ اس کا اثر بڑا دور رس ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ کسی قوم کے تمدن (CULTURE) کا اس سوال سے بڑا گہرا تعلق ہے کہ اس قوم نے جنسی تعلقات کو آزاد چھوڑ رکھا تھا یا اس پر پابندیاں لگا رکھی تھیں اور اگر پابندیاں لگا رکھی تھیں تو وہ کس نوعیت کی تھیں۔ انہی محققین

ڈاکٹر انون

میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر (J.D.Unwin) کا نام خاص شہرت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر انون نے دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے اسی غیر مہذب (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ہے؟ اگر ان میں ایک قبیلہ جنوبی امریکہ کا ہے۔ تو دوسرا قطب شمالی کا۔ ایک آسٹریلیا کا

---

[1] واضح رہے کہ ان کا انداز اس طریق سے مختلف ہے جو آجکل (بالخصوص) امریکہ میں رائج ہے اور جس کی رو سے ایک خاص خطہ یا طبقہ کے لوگوں کو سوالنامہ دیا جاتا ہے اور ان کے جوابات سے اعداد و شمار Statistics مہیا کر کے نتائج اخذ کر لئے جاتے ہیں اور ان نتائج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالمگیر اور فطرت انسانی کے ترجمان ہیں۔ آجکل امریکہ میں (KINSLEY) کے قسم کے محقق اسی انداز سے جنسیات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ طریق کار کبھی عالمگیر Universal نتائج بہم نہیں پہنچا سکتا۔

ہے تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس محقق نے سولہ مہذب اقوام کی معاشرت کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائجِ تحقیقات کو اپنی گراں بہا کتاب (Sex And Culture) میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے:-

دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل۔ سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط کردہ نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔

اصل کتاب سے بھی پہلے' دیباچہ میں لکھا ہے کہ

اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عاید کر رکھی ہوں۔ (XIV)

اسی کلیہ کو اس نے اصل کتاب میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو۔ اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لئے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔ (صفحہ ۳۴۰)

آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلقات محض ایک حیوانی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دارومدار اسی جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر انون یہ بھی لکھتا ہے کہ

اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (صفحہ ۳۰۲)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۳۳۰)

اس لئے اگر کسی قوم میں تمدنی تبدیلی واقع ہو یعنی اسے دنیا میں عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آجائے تو اس عروج و زوال کے اسباب سمجھنے کے لئے دیکھنا چاہیئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے ہاں جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں جیسی وہ تبدیلیاں ہونگی اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے۔

جبری تجرد سب سے پہلے تجرد کی زندگی (Celibacy) کو لیجئے جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلکِ خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لئے اولین شرط قرار دیتی ہے۔ اسکے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ

جبری تجرد (Compulsory Celibacy) کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۳۹۴)

جبری تجرد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقائد یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ تجرد کی زندگی وجہِ شرف و تقدس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں (NUNS) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

عیسائیت یا مسلکِ خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرد کی زندگی ہی شرفِ انسانیت کی زندگی ہے تو دوسری طرف آجکل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عاید کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر اَنون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال یکسر غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عاید کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں۔ انھیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ (دیباچہ صلا)

اس تمہید کے بعد آگے چلئے۔ ڈاکٹر اَنون نے قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدنی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ سب سے نچلے درجے کا نام (Zoistic) رکھتا ہے اور اس سے اوپر Manistic کا درجہ ہے اور سب سے اوپر Deistic کا درجہ۔ اس کے بعد وہ انہی قبائل کی تمدنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

تین گروہ

(۱) جس گروہ نے کنوارپن (PRE NUPTAL) کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھے۔

(۲) جن قبائل میں زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عاید تھیں وہ تمدنی سطح کے درمیانی درجے پر تھے اور

(۳) تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و بکارت Chastity کا شدت سے تقاضا کرتے تھے اور زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے (ص ۳۲۵-۳۰۰)

اس کے بعد ڈاکٹر اَنون، شادی کے بعد کے جنسی ضوابط سے بحث کرتا ہے۔ لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے وہ اس حقیقت پر پھر زور دیتا ہے کہ

شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے جب تک شادی سے پہلے زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔ (ص ۳۴۳)

اس مقصد کے لئے وہ شادی کو چار بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی

(۱) عورت اپنی ساری زندگی ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی میں ایک عورت کا خاوند ہے ان کے رشتۂ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو۔ بجز اس کے کہ عورت ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے

اس کا نام، اس کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج (Absolute Monogamy) ہے۔

(۲) رشتۂ نکاح عمر بھر کے لئے نہ ہو بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہو سکتا ہو اسے وہ ترمیم شدہ وحدتِ زوج (Modified Monogamy) کی اصطلاح سے تعبیر کرسکتا ہے۔

(۳) عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے اس کا نام اسکے نزدیک مطلق تعدد ازواج Absolute Polygamy ہے۔ اور

(۴) اگر مرد، دوسری عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کرلے) تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔ اسے وہ ترمیم شدہ تعدد ازداج (Modified Polygamy) کہتا ہے۔

ڈاکٹر انون کا کہنا ہے کہ

آج تک کوئی قوم شق ملے کے "مطلق وحدتِ زوج" کے مسلک کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی (ص۳۴۴)
اس لئے کہ یہ شکل اسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے جب معاشرہ میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہ کی جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی مطیع و فرمانبردار لونڈی بن کر رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی معاشرہ میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا ردعمل ایسا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر "کامل آزادی" کا مطالبہ کردیتی ہے۔ اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی نوضویت Sexual Anarchy جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (ص۳۴۵)

اس کے بعد ڈاکٹر انون نے کہا ہے کہ تاریخ اس وقت تک جن اقوام و قبائل کے حالات محفوظ رکھ سکی ہے۔ ان میں سب سے بہتر تمدن کی حامل وہ قوم تھی جو شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلقاً اجازت نہیں دیتی تھی اور شادی کے بعد شق ملے کی ترمیم شدہ وحدتِ زوج کی پابند تھی۔ یعنی جن کا عام اصول یہ تھا کہ شادی کے بعد بھی جنسی تعلق صرف میاں بیوی میں رہے۔ رشتۂ نکاح محکم و استوار ہو لیکن ناقابلِ تنسیخ نہ ہو۔ بلکہ بعض حالات کے ماتحت منقطع ہوسکتا ہو۔ یہ بعینہٖ وہ شکل ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔

بہترین تمدن کی حامل قوم

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تعلقات پر اس قسم کی قیود و حدود عاید کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انون نے مختلف ماہرین علوم کی شہادات سے اہم نتائج مستنبط کئے ہیں وہ کہتا ہے کہ

جنسی تعلقات کی حدبندی سے ایک قسم کا ذہنی اور عصبی تناؤ (Tension) پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توانائی میں ارتکاز (Compression) پیدا ہوجاتا ہے۔ (ص۳۱۳)

یہ مرتکز شدہ معاشرتی توانائی اپنی نمود کے مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس نفسیاتی عمل کو، ڈاکٹر فرائڈ کی اصطلاح میں کظامت

(Sublimation) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ

نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوت فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی۔ (صفحہ ۳۱۱)

فرائڈ کی تحقیق

بہتر ہو کہ اس موقعہ پر خود فرائڈ کے الفاظ ہمارے سامنے آجائیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوئی ہے کہ لوگوں نے اپنے قدیم جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا ہے اور یہ عمارت دن بدن اوپر کو اٹھتی جا رہی ہے کیونکہ ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے (جب ان کی بے باکانہ تسکین ہی مقصدِ زندگی نہ بن جائے تو) یہ اپنا رخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں (جسے Sublimation کہتے ہیں) اور اس طرح افراد کی فالتو توانائی، جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ فرائڈ کی تحقیق کے مطابق، اگر جنسی توانائیوں کو بے محل ضائع نہ کیا جائے تو یہ انسانی تہذیب و تمدن کے قصرِ حسین کی تعمیر میں کس قدر ممد و معاون بن جاتی ہیں۔ ؎

فرائڈ نے اس طریقِ عمل کا نام Sublimation رکھا ہے۔ یہ علم تجزیہ نفس (Psycho-Analysis) کی ایک اہم اصطلاح ہے اور دورِ حاضر کی ایک گراں قدر نفسیاتی تحقیق۔ لیکن آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ انسانی ذہن نے جہاں اسے بیسویں صدی میں دریافت کیا ہے، قرآن نے چھٹی صدی عیسوی میں [جسے عام طور پر ازمنۂ مظلمہ (Dark-Ages) کہا جاتا ہے]

قرآنی کظامت

کس طرح اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سورۂ آلِ عمران میں مومنین کی ایک صفت الکاظمین الغیظ بتائی گئی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس لفظ کے بنیادی معانی کو سامنے لانا ضروری ہے۔ عرب ایک گرم اور خشک ملک ہے جہاں پانی کی اکثر قلت رہتی ہے وہ کرتے یہ تھے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کنوئیں کھودتے۔ ان میں کسی میں کم پانی نکلتا کسی میں زیادہ۔ پھر وہ ان کنوؤں کو آبدوز نالیوں Subterranean Channels کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیتے۔ اس طرح جس کنوئیں میں پانی زیادہ ہوتا، اس کا فالتو پانی دوسرے کنوئیں کی طرف منتقل ہو جاتا اور یوں تمام کنوؤں میں پانی کی تقسیم یکساں ہو جاتی۔ اس طریق عمل کو ان کے ہاں کَظَامَتٌ کہا جاتا تھا۔ لہٰذا الکاظمین الغیظ کے معنی ہوئے وہ لوگ جو اپنی اس حرارت

؎ اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ فرائڈ نے جنسیات کے متعلق اپنی تحقیق اور فکر میں جس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں، ان کے جو نقصان رساں نتائج مغربی معاشرہ میں نمودار ہو رہے ہیں وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں، ہم اس وقت صرف فرائڈ کے اس خیال سے بحث کر رہے ہیں کہ جنسی توانائی کو اگر بے باک ہونے دیا جائے تو یہ اپنا رخ تعمیری مقاصد کی طرف موڑ لیتی ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اور توانائی کو جو غصے کی شکل میں باہر نکلنا چاہتی ہے کسی دوسری طرف منتقل کرکے اس سے تعمیری نتائج کا کام لیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے عصرِ حاضر کے ماہرینِ تجزیۂ نفس نے (Sublimation) سے تعبیر کیا ہے۔

اب ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ڈاکٹر اَنون نے بتایا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عاید کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل اور محاسبۂ خویش کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس

> جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کریں۔ ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی باقی نہ رہی۔ (ص ۳۹۸)

اضمحلال

قرآن کریم نے ایک جگہ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَلَا یَزْنُوْنَ وہ زنا کے قریب تک نہیں جاتے۔ اس لئے کہ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا (۲۵/۶۸) جو قوم ایسا کرتی ہے اسے اِثْمٌ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ عربی زبان میں اٰثِمَةٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو تھک کر مضمحل ہو جائے اور اس میں اتنی توانائی نہ رہے کہ وہ باقی قطار کے ساتھ چل سکے۔ اس لئے وہ ان سے پیچھے رہ جائے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ کے اندر اس تمام حقیقت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ جس تک دورِ حاضر کی تحقیق اس قدر تجربات کے بعد پہنچی ہے۔ یعنی یہ کہ جنسی جذبات کو آزادانہ چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مضمحل ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس میں وہ معاشرتی توانائیاں نہیں رہتیں جو قوموں کو تمدنی بلندیاں عطا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر اَنون نے یہ بھی کہا ہے کہ

> مردوں کی عصمت اسی صورت میں معاشرتی توانائی پیدا کر سکتی ہے جب عورتیں باعصمت ہوں اور ان کی عصمت شادی سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں محفوظ ہے۔ (ص ۳۲۳)

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے قرآن مردوں اور عورتوں دونوں کی عصمت پر یکساں زور دیتا ہے وہ حٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ (وہ مرد جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہوں) کے ساتھ وَالْحٰفِظٰتِ (۳۳/۳۵) بھی کہتا ہے۔ یعنی وہ عورتیں جو اپنے دامنِ عفت کو قطعاً داغدار نہ ہونے دیں۔ اور جرم زنا کی سزا بھی مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں تجویز کرتا ہے (۲۴/۲)

قرآنی حد بندی

قرآن کی رو سے جنسی اختلاط کی صرف ایک ہی صورت جائز ہے۔ یعنی نکاح۔ لہٰذا قبل از نکاح جنسی اختلاط اور نکاح کے بعد عورت کا کسی دوسرے مرد سے، یا مرد کا کسی دوسری عورت سے، جنسی اختلاط (خواہ وہ تراضیٔ طرفین ہی سے کیوں نہ ہو) زنا ہے۔ نکاح کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ ہنگامی جنسی اختلاط کی رضامندی نہیں ہوتی۔ بلکہ معاہدہ ہوتا ہے اس امر کا کہ ہم (میاں بیوی) ان تمام قیود و حدود اور حقوق و فرائض کے مطابق جو ہم پر قرآن نے عاید کی ہیں مستقل رفاقت کی زندگی بسر کریں گے۔ اسی سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر اَنون نے اپنے ہاں زنا کا لفظ استعمال نہیں کیا (اسے

اس لفظ کے استعمال کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ وہ مذہبی یا اخلاقی بحث نہیں کر رہا بلکہ جنسی مسئلہ کے متعلق علمی اور نظری تحقیق کر رہا ہے۔ لہٰذا اس کا انداز سائنٹیفک ہونا چاہیئے تھا) اس نے اپنے ہاں جنسی اختلاط کے مواقع (Sexual Opportunitie) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جس قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ ہوں گے وہ قوم تمدنی سطح میں بہت پست ہوگی اور جس میں یہ مواقع کم از کم حد تک رکھے جائیں گے، وہ تمدنی سطح کی بلندیوں تک پہنچ جائے گی۔ قرآن نے صرف زنا ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ جنسی اختلاط کے مواقع کو کم سے کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں قبل از نکاح جنسی اختلاط کے مواقع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ زنا ہے۔ نکاح کا معاہدہ، اس کے نزدیک عمر بھر کی رفاقت (Life-long Companionship) کا معاہدہ ہے۔ لہٰذا اس میں وقتی جنسی اختلاط کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ خواہ وہ باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو پھر اس نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (پختہ عہد) کہا ہے۔ بچوں کا کھیل نہیں کہا ہے کہ جب جی چاہا کھیل کھیل لیا اور جب طبیعت اکتا گئی تو اس مٹی کے گھروندے کو پامال کر دیا اور دوسرے وقت پھر نیا گھر بنا لیا۔ علاوہ بریں اس نے وحدتِ زوج (MONOGAMY) کو بطور اساسی اصول مقرر کیا ہے اور تعددِ ازدواج کو محض ایک ہنگامی تمدنی مشکل کے حل کے لئے بطور عارضی

وحدتِ ازدواج

علاج جائز قرار دیا ہے (اس کی بھی محض اجازت ہے، حکم نہیں) آپ دیکھیں گے کہ شادی کی یہ (قریب قریب) وہی شکل ہے جسے اوَن نے مطلق وحدتِ زوج (Absolute Monogamy) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ میں نے "قریب قریب" اس لئے کہا ہے کہ ڈاکٹر اوَن کے نزدیک "مطلق وحدتِ زوج" میں شادی صرف اسی صورت میں منقطع ہو سکتی ہے جب عورت جنسی (اخلاقی) جرم کی مرتکب ہو جائے لیکن قرآن نے نباہ نہ ہو سکنے کو بھی فسخ معاہدہ (طلاق) کی معقول اور جائز وجہ قرار دیا ہے۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ وہ زمانہ قبل از نکاح میں جنسی اختلاط کے کسی ایک موقع کو بھی جائز قرار نہیں دیتا۔ اور نکاح کے بعد عام حالات میں صرف ایک جوڑے کو باہمدگر وابستہ رکھتا ہے۔ تنوع (Change) کی خاطر تنوع (Change) کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن نے تو نکاح کی صورت میں بھی محصنین کے ساتھ غیر مسافحین (۴/۲۴) کا اضافہ کیا ہے حصن کے معنی ہیں محفوظ رکھنا اور سفح کے معنی ہیں پانی وغیرہ کا بہا دینا۔ لہٰذا جہاں اس حکم میں زنا سے ممانعت مقصود ہے وہاں اس سے یہ بھی متصور ہے کہ نکاح کا مقصد بھی شہوت رانی نہیں۔ اس سے نکاح کی تمام ذمہ داریوں کی حفاظت اور بقائے نسل کا تحفظ مقصود ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ صرف وہی قوم زندگی کی کامرانیوں سے بہرہ یاب (مفلح) ہو سکتی ہے۔ جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے جائے۔ اور یہ کم از کم مواقع بھی صرف معروف (RECOGNISED) طریق سے مہیا کئے جائیں۔ اور ڈاکٹر اوَن کی تحقیق یہ ہے کہ

انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت "مطلق وحدتِ زوج" کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخِ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود

وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو، جب عقدِ نکاح، مساوی حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو۔ اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی شناسا۔ تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام نے ایسی معاشرتی رسوم اختیار کرلی تھیں جو زندگی بھر کی جبری رفاقت کے قریب قریب پہنچ گئی ہوں۔ (اس لئے کہ اس وقت تک زندگی بھر کی جبری رفاقت تک کوئی قوم بھی نہیں پہنچ سکی) اور جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا۔ وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے۔ (ص۳۸۲)

آپ نے دیکھا کہ زمانے کی علمی شہادتیں کس طرح قرآنی حقائق کی تائید کرتی چلی جارہی ہیں اور دنیا کس طرح (غیر شعوری طور پر خود بخود) قرآن کے قریب آتی جارہی ہے!

عربوں کی تاریخ

ڈاکٹر انون نے اپنی تحقیق کے دوران میں ضمناً مسلمانوں (عربوں) کی تاریخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں بتاتا ہے کہ قدیم عرب، قبل از نکاح عصمت و بکارت پر زور نہیں دیا کرتے تھے۔ بعد میں (اسلام کی تعلیم کے ماتحت) انہوں نے اس عصمت پر شدت سے زور دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے محدود ملک سے نکل کر گرد و نواح کی دنیا پر پھیل گئے اس کے بعد جب انہوں نے اپنے حرم میں عورتوں کی بھرمار شروع کردی تو ان کی فتوحات کی وسعتیں رک گئیں۔ (ص۳۲۹) اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ایک اور تاریخی عنصر کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ (اہل کتاب) کی لڑکیوں سے شادی کی اجازت کیوں دی تھی۔ ڈاکٹر انون کے اس اصول کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ کسی قوم کی تمدنی تعمیر میں عورت کی محفوظ توانائی کا بہت بڑا اثر ہے بلکہ یہ کہ مردوں کی توانائی بھی اسی صورت میں تعمیری نتائج پیدا کرسکتی ہے جب ان کی عورتیں باعصمت ہوں۔ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ جب عربوں کی فتوحات کا سلسلہ مصر میں جاکر رک گیا تو انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی لڑکیوں سے شادی کی۔ ان لڑکیوں کی تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں جنسی ضبط پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کی مرکوز توانائیاں عربوں کی مزید وسعتوں اور تمدنی بلندیوں کا باعث بن گئیں۔ یہی کچھ مصر میں ہوا اور یہی کچھ اسپین میں (ص۳۲۹) کسی کو ڈاکٹر انون کی تحقیق کے اس نتیجے سے اختلاف ہو یا اتفاق۔ لیکن یہ حقیقت بہرکیف اپنی جگہ پر غیر متنازعہ رہ جاتی ہے کہ اس محقق کے نزدیک، کسی قوم کی فتوحات کی وسعتوں اور تہذیب کی بلندیوں پر اس کی عورتوں کی عصمت و ضبط کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور یہی حقیقت قرآن نے بیان کی ہے جب اس نے زندگی کی کامرانیوں کے لئے مردوں اور عورتوں دونوں کے "محصن" (قلعہ بند) ہونے کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کا محصن ہونا جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم درجے تک لے آتا ہے (یعنی زمانہ قبل از نکاح میں مطلق عصمت۔ نکاح میں وحدتِ زوج (Monogamy) بطور اساسی اصول۔ اور نکاح کے بعد میاں اور بیوی کا کسی

غیر عورت اور مرد کے ساتھ اختلاط ناجائز) لیکن جب کسی قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہو جائیں (جس کی شکل صرف زنا ہی نہیں بلکہ اس ہنگامی ضرورت کے بغیر جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے، بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں۔ طلاق کی رخصت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آزادانہ تبدیلیٔ ازواج۔ اور قرآن کے کھلے کھلے حکم کے خلاف لونڈیوں کی بھرمار سے سینکڑوں عورتوں سے اختلاط'

جنسیات میں اُلجھی ہوئی قوم کی حالت

یہ سب جنسی اختلاط کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانے کی شکلیں ہیں) تو پھر اس قوم میں نہ تو آگے بڑھنے کی توانائیاں رہ جاتی ہیں۔ اور نہ ہی اپنے تمدن کو علیٰ حالہ قائم رکھنے کی صلاحیتیں باقی۔ اس قسم کی قوم زندگی کی کس سطح پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ

> اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت، تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی[۲]۔ وہ واقعات کے اسباب (علل Causes) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں) ..... وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں..... اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے (اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز۔ گنڈہ تعویذ۔ اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ) اس قسم کے معتقدات اس قوم میں نسلاً بعد نسل متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں، اور مر جاتے ہیں۔ اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیا ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے۔ بالکل حیوان ہوتے ہیں[۳]۔ (صفحہ ۳۲۶-۳۲۵)

آپ نے دیکھ لیا نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آ رہی اور کیا آج بھی ساری دنیا میں ہماری یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ہمارے خود ساختہ مذہبی تصورات

---

[۱] رابرٹ برفالٹ Briffault نے جنسیات کے متعلق ایک بڑی وقیع اور ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے The Mothers اسی میں وہ ایک گُرد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر بیک وقت ایک ہی بیوی رکھی لیکن وہ (غالباً) چالیس کے قریب بیویاں بدل چکا تھا۔ یہ جنسی اختلاط کے متنوع مواقع کی ایک مثال ہے۔ اس سے اور مثالوں کا بھی اندازہ لگا لیجئے۔ [۲] دیکھئے یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا کہ لہم قلوب لا یفقہون بھا ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ [۳] یہ بھی قرآن ہی کی آیت کا ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام (۴۷/۱۲) وہ سامانِ زیست سے اسی طرح فائدہ حاصل کرتے اور کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان۔

نے عطا کر رکھی ہیں۔؟

جب ہماری قوم کی جنسی زندگی قرآنی سواحل میں گھری ہوئی تھی تو یہ ساری دنیا پر چھا گئی تھی۔ اور جب ملوکیت نے اسے بدلگام کر دیا اور شریعت کے نام پر وہ سب کچھ ہونے لگا جسے قرآن روکنے کے لئے آیا تھا تو ان کی ساری توانائیاں ضائع ہو گئیں۔ ان میں پھر نہ فکر کی صلاحیت رہی نہ عمل کی اور یہی حالت اس وقت تک چلی جا رہی ہے۔ ان کے ممالک میں لونڈیاں آج تک سربازار بکتی ہیں۔

ہمارا نوجوان طبقہ یہ تو ہے ہمارے اس طبقہ کی حالت جسے قدامت پرست کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے نوجوانوں کا طبقہ ہے جنہوں نے مغرب کی دیکھا دیکھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنا انفرادی آزادی کو مقید کرنا ہے۔ اس لئے "ازمنہ مظلمہ" کے ان اغلال و سلاسل کو جتنی جلدی توڑ دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے چنانچہ انہوں نے عملاً اسے توڑنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ان آزادیوں سے وہ سوسائٹی متشکل ہوتی ہے جس کے متعلق انون لکھتا ہے کہ اس میں

> ہر لڑکی کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا جنسی کھیل کھیلنا چاہے کھیلتی پھرے اور جس نوجوان سے چاہے جنسی اختلاط قائم کرے۔ اس کے لئے فقط ان دونوں کی رضامندی کی شرط ہے۔ نہ لڑکی پر کسی قسم کی پابندی عائد ہوتی ہے نہ لڑکے پر۔۔۔۔ بچپن ہی سے وہ ہر ایسا جنسی کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں جن میں انہیں لذت ملتی ہو۔۔۔۔
> مختصر یہ کہ وہ ایک ایسی فضا میں رہتے ہیں جس میں جنسی حدود و قیود کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جس میں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جونہی جنسی خواہش ہوئی۔ اسے اسی وقت کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا۔ (صـ ۳۴)

اس کا نتیجہ یہی ہیں وہ جنسی آزادیاں جن کا متمنی ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ان آزادیوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اسے خود ڈاکٹر انون کی زبان سے سن لیجئے وہ کہتا ہے کہ

> لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹا دیا جائے اور قوم زندگی کی ان خوشگواریوں سے بھی متمتع ہوتی رہے جو ایک بلند تمدن کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی ہیئت ترکیبی اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یکجا جمع نہیں ہو سکتیں یہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ جو ریفارمر ان میں مفاہمت Compromise کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کیک کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے کوئی انسانی معاشرہ ہو اُسے ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یا تو ان صلاحیتوں کو پابند رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ہیں اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ہے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جا سکتی۔ (صـ ۴۱۲)

بنابریں۔

> کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل

ترین حد تک محدود کر دیئے جائیں، مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی (صفحہ ۴۱۳)

پس چہ باید کرد

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کس طرح کی جائے جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک سمیٹا جایا جائے۔ اور پھر ایسی صورت پیدا کی جائے کہ جنسی مواقع کی یہ شکل مستقل طور پر قائم رہ سکے تاکہ اس طرح وہ قوم انسانیت کی صلاحیت بخش توانائیوں کی حامل بنتی چلی جائے۔ ڈاکٹر انون نے اپنی کتاب کا خاتمہ اسی سوال (اور اس کے جواب) پر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> تاریخ کے صفحات پر کوئی سوسائٹی ایسی نظر نہیں آتی جو اس کوشش میں کامیاب ہو گئی ہو کہ وہ جنسی اختلاط کے مواقع کو ایک مدت مدید تک، کم از کم حد تک محدود رکھ سکی ہو۔ میں تاریخی شواہد سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کسی قوم نے ایسی صورت پیدا کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کرے۔ (صفحہ ۴۳۱-۳۲)

آپ نے غور کیا کہ اس محقق کی تحقیق کے مطابق اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کی بنیادی شرط کیا ہے؟ یہ کہ اس میں مرد اور عورت کو

مرد اور عورت کی مساوی حیثیت

قانوناً مساوی درجہ عطا ہو! آج اس معاشرہ میں جس میں ہم صدیوں سے چلے آ رہے ہیں یہ کہنا کہ اسلام نے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کیا تھا، شاید اپنی ہنسی اڑانے کے مترادف ہوگا۔ لیکن اس حقیقت کو کون چھپا سکتا ہے کہ قرآن نے یہ اعلان آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کیا تھا کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲/۲۲۸) قاعدے اور قانون کی رو سے عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنے ان کے فرائض ہیں۔ لہٰذہ قانون کی نگاہ میں مرد اور عورت دونوں کو مساوی درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے تو کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ اپنے معاشرے کو قرآنی خطوط پر متشکل کریں۔

آخر میں ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ

> اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدت مدید تک، بلکہ ابد الآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدت مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم حد تک محدود رہیں! اس طرح اس معاشرہ کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اور انسان کی توانائیاں اسکی

ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آسکتا (ص۳۲)

قرآن ایسے ہی معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے نہایت واضح قوانین دیئے ہیں۔ وہ عائلی زندگی کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ وہ جہاں صلوٰۃ و زکوٰۃ جیسے امور کے متعلق بالعموم اصولی قوانین دیتا ہے وہاں عائلی زندگی کے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے۔ اگر وقت ہوتا تو میں مسلسل خطبات کے ذریعے ان تمام احکام کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے لاتا جس سے آپ کو اندازہ ہوتا کہ قرآن کس قسم کے معاشرہ کا نقشہ دیتا ہے اور اس کے نزدیک جنسی تعلقات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ (اس کے متعلق اگر آپ تفصیل سے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" کا مجموعہ دیکھئے جس میں ان تمام امور کو یکجا بیان کر دیا گیا ہے)

ایک بنیادی حقیقت

لیکن اس ضمن میں ایک بنیادی حقیقت ایسی ہے جس کا آخر میں بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جنسی جذبہ بھی بھوک، پیاس، نیند وغیرہ کی طرح ایک فطری جذبہ ہے جس کی تسکین نہایت ضروری ہے اور جس طرح بھوک پیاس وغیرہ کی اضطراری حالت میں عام قوانین کو ڈھیلا (Relax) کر دیا جاتا ہے اسی طرح جنسی قوانین کی بندشوں کو بھی ڈھیلا کر دینا چاہیئے۔ یہ تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک فطری جذبہ (Natural Instinct) ہے لیکن اس میں اور بھوک پیاس وغیرہ میں ایک بنیادی فرق ہے اس فرق کو ایک مثال (بلکہ اپنے روزمرہ کے مشاہدہ) سے سمجھئے۔ آپ کسی کام میں منہمک بیٹھے ہیں۔ آپ کو پیاس لگتی ہے۔ شروع میں آپ کو اس کا خیال نہیں آتا۔ وہ بڑھتی ہے تو آپ کو اس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ پانی پی لیتے ہیں تو فبہا ورنہ اس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ آپ کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ اور اگر آپ کو کچھ دنوں کے لئے پانی نہ ملے تو اس سے آپ کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بھوک کی بھی ہے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ

(۱) بھوک پیاس وغیرہ کا تقاضا ازخود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں آپ کے خیال اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور

(۲) اگر ان تقاضوں کی تسکین نہ کی جائے تو کچھ وقت کے بعد اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو اضطراری حالت کہتے ہیں۔ اس حالت میں (جان بچانے کی خاطر) ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عام حالات میں حرام ہیں۔

خیال کا دخل

لیکن جنسی تقاضا کی کیفیت ان سے بالکل جدا ہے۔ جنسی تقاضا کبھی نہیں ابھرتا تا وقتیکہ آپ اس کا خیال نہ کریں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور نمود یکسر آپ کے خیالات سے وابستہ ہے۔ اگر آپ کا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی اضطراری حالت کے لئے حرام کو حلال نہیں قرار دیا۔ بلکہ کہا یہ ہے کہ جس کے لئے نکاح ممکن نہ ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے۔ (۳۳/۲۴)

ضبطِ نفس

اور یہ ضبطِ نفس کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ جس تقاضا کی بیداری کا مدار انسان کے اپنے خیالات پر ہو،

اس پر کنٹرول رکھنا انسان کے اپنے بس کی بات ہوتا ہے۔ نہ خیالات کو طبیعت آوارہ بنایئے۔ نہ توجہ اس طرف جائے۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ جس معاشرہ میں حالت یہ ہو جائے کہ

صید خود صیاد را گوید بگیر

اس میں ایک فرد (بالخصوص نوجوان طبقہ) اپنے خیالات پر کس طرح کنٹرول رکھ سکے؟ یہ بات ایک حد تک درست ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن چور ہی کو نہیں بلکہ چور کی ماں کو بھی مارتا ہے۔ وہ صرف ارتکابِ جرم کے بعد مجرم کو نہیں پکڑتا بلکہ ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس میں ان جرائم کے ارتکاب کے مواقع کم از کم ہو جائیں۔ اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (۶/۱۵۲) تم فواحش کے قریب تک نہ جاؤ۔ یعنی فواحش تو ایک طرف جو اسباب و ذرائع فواحش تک لے جانے والے ہوں ان سے بھی مجتنب رہو۔ ان اسباب و ذرائع میں وہ بھی شامل ہیں جو بظاہر نظر آ جاتے ہیں۔ اور وہ بھی جو نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں یعنی دل میں گذرنے والے خیالات جو آہستہ آہستہ انسان کو فواحش تک لے جاتے ہیں۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹) وہ نگاہوں کی خیانت اور دل کی چوری (راز) تک سے واقف ہے اس قسم کی روش کو تطہیرِ قلب و نگاہ کہتے ہیں۔ یعنی دل اور آنکھ کی پاکیزگی۔ اس مقصد کے لئے قرآن مردوں اور عورتوں کے اختلاط (میل جول) کے متعلق تفصیلی ہدایات دیتا ہے (انہیں پردے کے احکام کہا جاتا ہے) مجھے افسوس ہے کہ اس کے لئے بھی وقت نہیں ورنہ میں بتاتا کہ قرآن کس طرح ایک ایسا معاشرہ وجود میں لاتا ہے جس میں عورتوں کی آزادی کو سلب نہیں کیا جاتا لیکن اس میں جنسی حرکات کبھی بے باک نہیں ہونے پاتے اور انسانی خیالات میں بے راہ روی نہیں پیدا ہوتی۔

بہر حال آپ نے یہ دیکھ لیا کہ مرد اور عورت کا جنسی اختلاط محض ایک طبعی فعل (Biological Action) نہیں جس کا تعلق صرف انسان کے جسم تک ہو۔ اس کا تعلق قوموں کی تہذیب و تمدن اور کلچر اور ثقافت کے ساتھ بڑا گہرا اور بنیادی ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ ایسا نہیں جسے یونہی نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم تمدن اور ثقافت میں ممتاز حیثیت حاصل کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جنسی تعلقات کو قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھیں۔ یعنی ان آزادیوں کو بھی محدود کریں جو مغرب کی اندھی تقلید سے ہمارے جدّت پسند طبقہ میں دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ اور ان "شرعی اجازتوں" کو بھی حدود اللہ کا پابند بنائیں جو غلط (یعنی غیر قرآنی) مذہب کی بنا پر ہمارے قدامت پسند معاشرہ میں صدیوں سے مروج چلی آ رہی ہیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہمارے ابھرنے اور آگے بڑھنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ سنت اللہ کسی کے لئے بدلا نہیں کرتی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

مجلسِ اقبال

تیرھواں باب

میر نجات نقشبند (المعروف بابائے صحرائی) کے نصائح جو انھوں نے مسلمانانِ ہندوستان کے لئے تحریر فرمائے۔

میر نجات نقشبند (بابائے صحرائی) ایک فرضی نام معلوم ہوتا ہے۔ یہ نصیحت نامہ خود علامہ اقبال کا ہے۔ جس میں انھوں نے تعلیمِ خودی کو اس انداز سے پیش کیا ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

اے کہ مثلِ گُل ز گِل بالیدۂ
تو ہم از بطنِ خودی زائیدۂ

خطاب خود انسان سے ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اس کے سلسلۂ تخلیق کی ابتدا مٹی (گِل) سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد قرآن ان مراحل کو گِناتا ہے جن سے کاروانِ حیات منزل بہ منزل گذرتا تا آنکہ وہ وادئ حیوانات میں آ پہنچا۔ جہاں تک جسمِ انسانی کا تعلق ہے اس کی تخلیق بھی اسی طبعی طریق (PHYSICAL PROCESS) سے ہوئی ہے جس سے دوسرے حیوانات کی پیدائش ہوئی۔ لیکن اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ انسان کی صورت میں اللہ نے اپنی الوہیاتی توانائی کا ایک شمہ اس میں ڈال دیا (نفخنا فیہ من روحنا) اس نے انسان کو حیوانات سے متمیز اور ممتاز کر دیا۔ واضح ہے کہ یہ روحِ خداوندی (یا الوہیاتی توانائی) اللہ کی ذات کا کوئی جزو (حصہ) نہیں جو اس سے الگ ہو کر پیکرِ انسانی میں جلوہ فرما ہو گیا ہے اور (تصوف کے عقیدہ کے مطابق) آخر الامر پھر ذاتِ خداوندی میں جا کر مل جائیگا یہ ایک توانائی ہے جو طبعی جسم کی پیدا کردہ نہیں بلکہ انسان کو الگ طور پر ملی ہے۔ اس کی نمود انسانی اختیار و ارادہ کی شکل میں ہوتی ہے جو انسان کے علاوہ کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں۔ اس توانائی کا مقام انسانی ذات (خودی) ہے جس کے مضمر ممکنات بے شمار ہیں۔ اس طرح انسان (مثلِ گُل۔ ز گِل) پیدا ہوا ہے۔ اس انسان سے حضرت علامہ کہتے ہیں کہ

از خودی مگذر بقا انجام باش
قطرۂ باشی بحر آشام باش

تو اپنی خودی کو ضائع مت ہونے دے بلکہ اس کے استحکام و بقا کی کوشش کر۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ذات خداوندی اگر ایک سمندر ہے تو اس کے مقابلہ میں تیری ذات کی حیثیت ایک قطرہ کی سی ہے۔ لیکن عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا نہیں۔ بلکہ بحر کو اپنے اندر جذب کر لینا ہے۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کی یہی تخصیص ہے۔ عام تصوف کی رُو سے انسانی ذات کا مآل یہ ہے کہ وہ ذات خداوندی میں جا کر فنا ہو جائے لیکن اقبال کے ہاں انسانی خودی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں اس قدر محکم و خودگیر ہو جائے کہ اپنی انفرادیت کو کہیں بھی ہاتھ سے نہ جانے دے۔ حتیٰ کہ خدا کے سامنے بھی

بخود محکم گذار اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحر نورش

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب فلسفیانہ اور متصوفانہ اندازِ گفتگو ہیں۔ مراد یہی ہے کہ انسان اپنی ذات میں صفات خداوندی کو (علیٰ حد بشریت) منعکس کرتا جائے۔ اس سے اسے حیاتِ جاوداں حاصل ہو جائے گی۔

توکہ از نور خودی تابندۂ
گر خودی محکم کنی پائندۂ

حیاتِ جاوید استحکامِ خودی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

سود در جیب ہمیں سودا ستے
خواجگی از حفظ ایں کالا ستے

یہی ایک ایسی تجارت ہے جو تمہارے لئے نفع بخش ہے۔ یہی وہ متاع گراں مایہ ہے جس کی حفاظت سے زندگی کی سرفرازیاں اور سربلندیاں حاصل ہو سکتی ہیں۔

ہستی و از نیستی ترسیدۂ
اے سرت گردم غلط فہمیدۂ

انسان محض جسم کا نام نہیں جو موت سے فنا ہو جاتا ہے۔ اس میں انسانی ذات بھی ہے جس کا طبعی موت سے کچھ نہیں بگڑتا۔ لہٰذا انسان کا موت سے ڈرنا ایک بنیادی غلط فہمی ہے۔ ہستی (BEING) کبھی نیستی (NON - BEING) نہیں ہو سکتی۔

چوں خبر دارم ز ساز زندگی
با تو گویم چیست راز زندگی

چونکہ میں سازِ زندگی کے اسرار و رموز سے واقف ہوں۔ اس لئے میں تجھے بتاتا ہوں کہ زندگی کا راز کیا ہے؟

غوطہ در خود صورت گوہر زدن
پس ز خلوت گاہِ خود سر برزدن

جس طرح پانی کا قطرہ آغوشِ صدف میں آہستہ آہستہ نشوونما حاصل کرکے گوہر آب دار بن جاتا ہے۔ اسی طرح تیرے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ اپنی خودی کو مستحکم کرتا جائے۔ اور اس طرح پختہ ہو کر خارجی کائنات کی طرف آجائے۔ اور وہاں ہر طاغوتی قوت سے ٹکرائے

باز نشۂ دردیشی درساز و دمادم زن

چو پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

جب تک انسان میں اپنی ذات (سیرت) کی پختگی پیدا نہ ہو جائے اسے مصائبِ زندگی میں متصادم قوتوں کے سامنے نہیں آنا چاہیئے۔ زندگی نام ہے

زیرِ خاکستر شرار اندوختن

شعلہ گردیدن۔ نظرہا سوختن

اپنی ذات کی مضمر حرارتوں کو جو جسم کی خاکستر کے نیچے چھپی اور دبی رہتی ہیں، یک جا کرتے چلے جانا۔ اور اس طرح چنگاریوں کے مجموعے سے شعلہ بن کر دوسروں کی نظروں کو جلا دینا۔

خانہ سوزِ محنتِ چل سالہ شو

طوفِ خود کن شعلۂ جوالہ شو

سعدی نے کہا تھا کہ ـــــ چہل سالہ عمرِ عزیزت گذشت ـــــ اسی سے اقبال بھی کہتا ہے کہ تو نے ... ... عمر تک محض طبعی ضروریات کے لئے تگ و تاز کی ہے۔ یا ظاہری علوم کی تحصیل میں سر کھپاتا رہا ہے تجھے چ... نام حاصل کو آگ لگا دے۔ اور اپنی سیرت کی پختگی کی طرف توجہ دے کر شعلہ جوالہ بن جائے۔

چالیس سال ا...

زندگی از طوفِ دیگر رستن است

خویش را بیت الحرم دانستن است

زندگی کے معنی یہ ہیں کہ انسان غیروں کا طواف چھوڑ دے۔ اور اپنی ذات کی نشوونما کے لئے سرگرمِ عمل رہے۔ اسے چاہیئے کہ خود اپنی ذات کو اپنا بیت الحرام سمجھے۔ یعنی کسی خارجی "کعبہ" کا طواف کرنے کے بجائے خود اپنی ذات کا تحفظ کرے۔

پر زن و از جذبِ خاک آزاد باش

ہمچو طائر ایمن از افتاد باش

تو کب تک مادی آلائشوں میں جذب رہے گا۔ کب تک محض جسم کو انسان اور جسمانی زندگی کو حیاتِ حقیقی سمجھتا رہے گا؟ ان غلط تصورات کو جھٹک کر الگ کر دے۔ اور زمین سے اڑ کر افلاک کی فضاؤں میں پرکشا ہو جا۔ تو ڈرتا ہے کہ فضا میں کوئی سہارا ایسا نہیں جس پر انسان اپنے پاؤں ٹکا سکے۔ اس لئے وہاں سے نیچے گر پڑنے کا خطرہ ہے۔ لیکن یہ تیری بھول ہے تو دیکھتا نہیں کہ پرندے اپنی فضاؤں میں اڑتے رہتے ہیں اور کبھی زمین پر گر نہیں پڑتے۔ اس لئے انسان مادی تقاضوں سے بلند ہو کر شرفِ انسانیت

کو اصل حیات سمجھے تو اُسے زندگیٔ جاوید حاصل ہو جائیگی۔ واضح رہے کہ اس سے مقصود یہ نہیں کہ انسان دنیا کو ترک کر دے۔ اور مادی تقاضوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی مادی تقاضوں کو منتہائے زندگی نہ تصور کرے۔ زندگی کا منتہیٰ ان سے بہت بلند ہے۔

تو اگر طائرِ اے ہوشمند
بر سرِ غار آشیانِ خود مبند

اگر تجھ میں اتنی قوت نہیں کہ عند الضرورت طبعی تقاضوں کی کشش و جاذبیت سے بلند ہو کر فضا کی پہنائیوں میں بال کشا ہو سکے تو تجھے اپنا آشیانہ غار کے دہانے پر کبھی نہیں بنانا چاہیئے۔ اس میں ہر وقت خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ذرا پاؤں پھسلا اور انسان فنا در آغوش ہو گیا۔

اے کہ باشی در پۓ کسبِ علوم
با تو میگویم پیامِ پیرِ روم

تو اگر علم حاصل کرنے کے پیچھے ہے تو میں تجھے مولانا روم کا ایک پیغام دیتا ہوں اُسے دل کے کانوں سے سنتا۔

"علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود"

اور وہ پیغام یہ ہے کہ اگر علم کا تعلق محض مادی کائنات سے ہے تو ایسا علم سانپ کی طرح ہے جو نہ معلوم تجھے کس وقت ڈس لے لیکن اگر علم کا تعلق تطہیر قلب و نگاہ سے ہے (جو وحی کی روشنی میں ہو سکتا ہے) تو پھر یہ علم بڑا سچا دوست ہے۔

اس مقام پر ایک اہم نقطہ کا سمجھ لینا ضروری ہے جس کے بغیر (جو کچھ آئندہ اشعار میں کہا گیا ہے اس کا) صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ علم اور وجدان (KNOWLEDGE AND INTUTION) کی کشمکش بڑی پرانی ہے۔ علم سے مراد لی جاتی ہے عقل (INTELLECT) اور جو کچھ عقل کے ذریعے سمجھ میں آسکے۔ یعنی محسوسات کا علم (SENSE PERCEPTIONS) اس کے مقابلہ میں وجدان۔ یا عشق۔ باطنی ذریعۂ علم کو کہتے ہیں جو کتاب سے نہیں بلکہ نظر سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ کشمکش درحقیقت افلاطون (PLATO) اور ارسطو (ARISTOTLE) کے نظریات کی جنگ ہے۔ افلاطون کے نزدیک یہ خارجی کائنات اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اصلی وجود عالم امثال (WORLD OF IDEAS) کا ہے جس کا علم حواس اور عقل کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا اس کے برعکس ارسطو منطق کا امام ہے اور عقل و ادراک کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ افلاطون کا نظریہ وہ بنیاد ہے جس پر تصوف کی ساری عمارت استوار ہے اور یہ ہمیشہ علوم عقلی سے برسرِ پیکار رہا ہے۔

قرآن کی رو سے نہ علوم کی یہ تقسیم صحیح ہے نہ ان کی باہمی کشمکش درست۔ اس کے نزدیک مستقل اقدار اور مطلق حقائق کے متعلق علم کا واحد ذریعہ وحی ہے جو صرف نبی پر نازل ہوتا ہے (یعنی ہوتا تھا۔ کیونکہ اب تو سلسلۂ وحی بند ہو چکا ہے) غیر از نبی اس علم کو

براہِ راست حاصل نہیں کرسکتا۔ اسے یہ علم صرف نبی کی طرف آئی ہوئی وحی کے ذریعے مل سکتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے قرآن کہتا ہے کہ یہ بالحق پیدا کی گئی ہے۔ اور اس کے متعلق علم انسانی عقل و بصیرت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مومن وہ ہے جو اس علم کے حصل کو وحی کی راہ نمائی میں نوعِ انسانی کی منفعت بخشیوں میں کام لائے۔

یہ ہے قرآن کی رو سے علم کی صحیح پوزیشن۔ وہ وجدان کو انکشافِ حقیقت کا ذریعہ قرار نہیں دیتا۔ اس لئے اس کے نزدیک عقل و وجدان کی کشمکش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اقبال کے ہاں علم و وجدان۔ عقل و عشق۔ ذکر و فکر۔ خبر و نظر۔ دل و دماغ کا تضاد و تخالف اور تصادم و تزاحم قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ اکثر و بیشتر مقامات پر عشق۔ نکر۔ نظر۔ وغیرہ سے اس کی مراد وحی کے ذریعے عطا شدہ علم ہوتا ہے۔ اور عقل۔ فکر۔ خبر وغیرہ سے مراد وہ علم جسے انسان اکتسابی طور پر حاصل کرتا ہے۔ اس اعتبار سے عشق۔ فکر۔ نظر وغیرہ کو عقل۔ فکر۔ خبر وغیرہ پر جو فوقیت اور افضلیت حاصل ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن اس کے کلام میں ایسے مقامات بھی سامنے آجاتے ہیں جہاں عشق۔ ذکر۔ نظر وغیرہ سے مراد تصوف کا باطنی علم ہوتا ہے۔ اور عقل۔ فکر۔ خبر سے مفہوم محسوسات کا علم۔ یہ درحقیقت تصوف کے اس اثر کا نتیجہ ہے جو ابتدائی تعلیم و تربیت سے اقبال کے دل پر مرتب ہوگیا تھا اور جو (بدقسمتی سے) کسی نہ کسی رنگ میں آخر تک باقی رہا۔ یہ ہیں اقبال کے کلام میں وہ مقامات جو ایک قرآن کے طالب علم کو ہمیشہ کھٹکتے رہتے ہیں۔ اور یہی ہیں وہ خطرناک گھاٹیاں جہاں سے (پیغام اقبال کے سلسلے میں) بڑوں بڑوں کے قدم پھسل جاتے ہیں۔ ان مقامات سے نہایت حزم و احتیاط سے گذرنا چاہیئے۔ یاد رکھیئے! علم یا وحی کا عطا فرمودہ ہے یا عقل انسانی کا حاصل کردہ۔ جس چیز کو تصوف کی دنیا میں باطنی علم قرار دیا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت ان نفسیاتی قوتوں کا نام ہے جو مختلف ریاضتوں اور مشقوں (EXERCISES) سے بیدار اور مرتقی (DEVELOPED) ہوجاتی ہیں۔ یہ چیز ہر شخص حاصل کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ غیر مسلم بھی۔

اس تمہید کے بعد اگلے اشعار کو سامنے لایئے۔ جن میں کہا گیا ہے کہ

آگہی از قصۂ آخوند روم
آنکہ داد اندر حلب درسِ علوم

کیا تو مرشد رومی کے قصے سے واقف ہے؟ اس داستان کا آغاز اس زمانے سے ہوتا ہے جب وہ حلب میں مختلف علومِ عقلی کا درس دیا کرتے تھے۔

پائے در زنجیرِ توجیہاتِ عقل
کشتیش طوفانیٔ ظلماتِ عقل

ان کے پاؤں میں عقلی دلائل (فلسفہ و منطق) کی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ اپنی کشتی کو فکری علوم کے تاریک اور متلاطم سمندروں میں کھیتے تھے۔

مرتے بیگانۂ سینائے عشق

بے خبر از عشق و از سودائے عشق

ان کی مثال حضرت موسےٰ کے زمانہ قبل از نبوت کی سی تھی جو فرعون کے محلات میں حکمت و سیاست کے دفاتر کا مطالعہ کرتے تھے لیکن تجلی گاہِ سینا کی نور افشانیوں سے بے خبر تھے۔ انھیں وہ مرشد رومی کا پتہ ہی نہیں تھا کہ عشق کیا ہوتا ہے اور اس کا سودا کسے کہتے ہیں۔

از تشکک گفت و از اشراق گفت

وز حِکم صد گوہر تابندہ سفت

تشکک و اشراق۔ قدیم فلسفۂ یونان کے دو مکاتبِ فکر تھے۔ پہلے کو (SCEPTICISM) یا (AGNOSTICISM) کہتے ہیں۔ اس فلسفہ کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسان حقائق اشیاء کا کلی علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ ان امور میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بالفاظ دیگر انسان نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا ہے اور نہ ہی اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اسے (قدیم فلسفہ کی اصطلاح میں) لاادریت کہتے ہیں۔ یعنی "میں نہیں جانتا"۔

اشراق (NEOPLATONISM) یہ دراصل افلاطون کے فلسفہ اور فلوطین (PLOTINUS) کی فکر کے امتزاج سے وجود میں آیا تھا۔ اس کی بنیاد وجدان پر ہے اور اس پر تصوف کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اشراق بہرحال فلسفہ (عقلی گفتگو) ہے۔ خواہ یہ تصوف ہی کا فلسفہ کیوں نہ ہو۔ اس لئے باطنی علوم کے مدعی اسے بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

حِکم۔ حکمت کی جمع ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کی طرف اشارہ ہو۔ یہ وحدت الوجود کے فلسفہ پر (فتوحاتِ مکیہ کے بعد) شیخ کی معرکہ آرا تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

مرشد رومی حلب میں ان علوم کے پڑھانے میں مصروف تھے۔ نیز

عقدہ ہائے قولِ مشائیں کشود

نورِ فکرش ہر خفی را وا نمود

قولِ مشائین سے مراد ارسطو کا فلسفہ ہے۔ چونکہ وہ اپنی درسگاہ میں چلتے پھرتے سبق پڑھایا کرتا تھا۔ اس لئے اسے مشاء کہتے ہیں یعنی بہت چلنے والا۔ اور اس کے متبعین کو مشائین (PERIPATETICS)۔ رومی ارسطو کا فلسفہ بھی پڑھاتا تھا۔ غرضیکہ اپنی فکر و عقل سے تمام مستور حقائق کو بے نقاب کرتا رہتا تھا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ

گرد و پیشش بود انبارِ کتب

بر لبِ او شرحِ اسرارِ کتب

اس کے اردگرد کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے اور وہ ان میں بیٹھا ان کتابوں کے اسرار و غوامض کی تشریح و تفسیر میں مصروف

درس تدریس نظر آتا کہ۔

پیرِ تبریزی ز ارشادِ کمال
جست راہ مکتبِ ملّا جلال

شاہ شمس الدین تبریزی اپنے پیرومرشد شیخ کمال الدین جنیدی کے حکم کے مطابق ملا جلال کے اس مکتب میں جا پہنچے۔ اور

گفت ایں غوغا و قیل و قال چیست
ایں قیاس و وہم و استدلال چیست

قیاس منطق کی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صغریٰ اور کبریٰ قائم کر کے نتیجہ اخذ کر لیا جائے۔ اسے منطق میں (SYLLOGISM) کہتے ہیں۔ وہم بھی منطقی اصطلاح ہے جس کی رو سے جزئی معانی کو سمجھا جاتا ہے۔

استدلال۔ فلسفیانہ طور پر حجت قائم کرنے کو کہتے ہیں۔ جس سے (ان کے نزدیک) حقیقت روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے

شاہ شمس الدین تبریزی، مکتب میں پہنچے اور ملا جلال سے کہا کہ تم نے یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ ان منطقی موشگافیوں اور فلسفیانہ نکات آفرینیوں سے کیا حاصل ہے؟ اس لایعنی قیل و قال میں کیا رکھا ہے؟

مولوی فرمود۔ ناداں لب بہ بند
بر مقالاتِ خردمنداں مخند

ملائے جلال نے کہا کہ اے بیوقوف! خاموش رہو۔ یہ ارباب عقل و خرد کی باتیں ہیں۔ ان کی ہنسی مت اڑاؤ۔ تمہیں کیا خبر کہ یہ کیا ہے؟

پائے خویش از مکتبم بیروں گذار
قیل و قال است ایں۔ ترا با وے چہ کار

جاؤ۔ میرے مدرسے سے باہر نکل جاؤ۔ یہ قیل و قال ہے۔ اس سے تیرا کیا کام؟

قالِ ما از فہمِ تو بالاتر است
شیشۂ ادراک را روشنگر است

ہماری باتیں تمہاری عقل و فہم سے بہت اونچی ہیں تو انھیں سمجھ نہیں سکتا۔ اس سے عقل کے آئینہ کو جلا ملتی ہے۔ تجھ میں عقل ہی نہیں اس لئے تجھے ان باتوں سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟

سوزِ شمس از گفتۂ ملا فزود
آتشے از جانِ تبریزی کشود

ان باتوں سے شاہ شمس الدین کا غصہ تیز ہو گیا۔ اس کے سینہ سے آتش خاموش کا شعلہ بھڑک اٹھا۔

بر زمیں برقِ نگاہِ او فتاد
خاک از سوزِ دمِ او شعلہ زاد

اس نے اپنی بجلی بھری نگاہیں زمین میں گاڑ دیں۔ اس سے خاک کے ذروں سے آگ بھڑک اٹھی۔

آتش دل خرمن ادراک سوخت
دفتر آں فلسفی را پاک سوخت

دل کی آگ نے عقل کے خرمن کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ ملا جلال کی تمام کتابیں خاکستر ہوگئیں۔

مولوی بیگانہ از اعجاز عشق
ناشناس نغمہ ہائے ساز عشق

ملا جلال بے چارہ کیا جانے کہ عشق کی کرامات کیا ہوتی ہیں؟ وہ کیا سمجھے کہ ساز عشق سے کیا کیا نغمے برآمد ہوتے ہیں۔ وہ مبہوت کھڑا اس تماشا کو دیکھ رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بالآخر اس نے مہر سکوت کو توڑا اور

گفت ایں آتش چساں افروختی
دفتر ارباب حکمت سوختی

کہا کہ تو نے یہ آگ کیوں بھڑکا دی، تو نے ارباب فکر و خرد کی ان کتابوں کو کیوں جلا دیا۔

گفت شیخ اے مسلم زنار دار
ذوق و حال است ایں ترا بائے چہ کار

شیخ نے کہا کہ اے وہ جو صرف نام کا مسلمان ہے لیکن ابھی تک زنار پوش ہے۔ یہ ذوق و حال کی باتیں ہیں تجھے ان سے کیا سروکار۔

آپ نے غور کیا کہ اہل باطن کے نزدیک "ارباب عقل و فکر" کا مقام کیا ہے؟ مسلم زنار پوش۔ یونہی نام کے مسلمان لیکن درحقیقت مسلک کفر کے پرستار۔ یا للعجب!

حال ما از فکر تو بالاتر است
شعلۂ ما کیمیائے احمر است

ملا جلال نے کہا تھا کہ — قال ما از فہم تو بالاتر است — شیخ شمس الدین نے کہا کہ — حال ما از فکر تو بالاتر است۔ وہ قال تھا یہ حال۔ وہ باتیں تھیں یہ واردات۔ اور "واردات" ہمیشہ فکر و عقل سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یہ عشق کا شعلہ تھا جسے سنگ پارس یا آب حیات کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد شیخ نے کہا کہ

ساختی از برف حکمت ساز و برگ
از سحاب فکر تو بارد تگرگ

تمہاری منطقی بحث آرائیوں میں عشق کی شعلہ سامانیوں کی کوئی رمق نہیں۔ یہ محض برف کی سلیں ہیں جو زندگی کو پیکر بے جان بنا دیتی ہیں۔ تیری فکر کا سرچشمہ یہی یخ بستہ سلیں ہیں۔ اس لئے تیرے سحاب فکر سے اولوں کی بارش ہوتی ہے۔ اس میں

نہ برق ہے نہ حرارت۔ تو اس موت آور علم پرستی کو چھوڑ اور

آتشے اندر زاز خاشاک خویش
شعلۂ تعمیر کن از خاک خویش

اپنے خاشاک سے آگ پیدا کر اور اپنی خاک سے شعلہ بھڑکا۔ جب تک علم کے ساتھ سوزِ عشق شامل نہیں ہوگا۔ اس میں زندگی بخش حرارتیں پیدا نہ ہوسکیں گی۔ تنہا فکر (عقل) ایمان کی قوت پیدا نہیں کر سکتی۔

علم مسلم کامل از سوزِ دل است — معنیٔ اسلام ترک آفل است
چوں ز بند آفل ابراہیم است — در میان شعلہ ہا نیکو نشست

قرآن میں داستانِ حضرت ابراہیم کے ضمن میں ہے کہ آپ جس قوم میں پیدا ہوئے وہ ستارہ پرست تھی۔ آپ نے ان کے اس باطل مسلک کی تمام بنیادی کو مخالفین پر بڑے بصیرت افروز انداز میں منکشف کیا۔ جب شام کو چمکتا ہوا ستارہ نمودار ہوا تو آپ نے ان سے کہا کہ تم کہتے ہو کہ یہ ہمارا معبود ہے؟ اس کے بعد جب وہ غروب ہوگیا تو آپ نے فرمایا کہ کیا معبود ایسے ہی ہوتے ہیں جو ابھی جگمگ جگمگ کر رہے ہوں اور ابھی نگاہوں سے غائب ہو جائیں۔ اسی طرح آپ نے چاند اور سورج کے طلوع و غروب پر ان سے کہا کہ جن ہستیوں کی کیفیت یہ ہو کہ وہ ہر آن تغیر پذیر ہوں وہ معبود کیسے ہوسکتی ہیں لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۔ میں تغیر پذیر اشیاء کو معبودیت کے لئے پسند نہیں کر سکتا۔ معبود وہی ہو سکتا ہے جو حی و قیوم ہو۔ جس میں کبھی تبدیلی نہ آسکے جو کبھی غروب نہ ہو۔

اقبال نے اسی حقیقت کو متعدد مقامات پر بیان کیا ہے کہ عقل کے فیصلے ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل۔ اس لئے یہ آفل ہیں۔ اس کے برعکس وحی مستقل اقدار کا علم عطا کرتی ہے۔ جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا لہٰذا وحی پر ایمان ہی انسان کو صحیح علم تک پہنچا سکتا اور تخریبی عناصر کی تباہ کاریوں سے بچا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو وہ قصۂ حضرت ابراہیم اور آتش نمرود کے استعارے میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام کے معنی ہی ترک آفل ہیں یعنی ہر آن بدلنے والے فیصلوں سے اجتناب اور ان کے برعکس مستقل اقدار پر ایمان۔ جب انسان وحی کی تعلیم پر اس طرح ایمان لے آتا ہے تو پھر وہ حضرت ابراہیم کی طرح آتش نمرود میں بے خطر کود پڑتا ہے اور وہ آگ اس کے لئے ہلاکت آفریں ہونے کے بجائے راحت سامان بن جاتی ہے۔

چوں ز بندِ آفل ابراہیم رست
در میانِ شعلہ ہا نیکو نشست

اس سے پہلے اقبال نے کہا ہے کہ

علم مسلم کامل از سوزِ دل است

سوزِ دل سے مراد اگر وحی پر ایمان لیا جائے تو پھر یہ حقیقت عین قرآن کے مطابق ہو جاتی ہے۔ قرآن وحی کی روشنی میں عقل

سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا علم جسے وہ عقلی طور پر حاصل کرتا ہے اُسی صورت میں مکمل ہو سکتا ہے۔ جب اس کے ساتھ وحی پر ایمان شامل ہو۔

اور اگر سوزِ دل سے مراد دل کی پاکیزگی ہو تو بھی بات صاف ہو جاتی ہے۔ جس علم کا تعلق صرف انسان کے دماغ سے ہو، اور اس سے اس کی سیرت و کردار پر کچھ اثر نہ پڑتا ہو، وہ علم نامکمل ہوتا ہے۔ نامکمل ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی۔

لیکن اقبالؒ نے جو حکایت پہلے لکھی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بے تکلف مرتب ہوتا ہے کہ اس میں شیخ تبریزی (تصوف کا نمائندہ) علم سے وحی کا امتزاج نہیں بتاتا بلکہ علم کے تمام دفاتر کو یکسر جلا دیتا ہے۔

دفترِ آں فلسفی را پاک سوخت

یہ خالصتاً تصوف کا مسلک ہے۔ جس کی رُو سے عقیدہ یہ قائم کیا جاتا ہے کہ العلم الحجاب الاکبر۔ علم حقیقت کے حسین چہرے پر ایک دبیز پردہ ہوتا ہے۔ جب تک اسے الگ نہ کر دیا جائے، عروسِ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آ سکتی۔ لہٰذا تصوف میں علم کے ساتھ موافقت (COMPROMISE) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں علم اور عشق، دو متضاد عناصر ہیں جو کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ جب تک علم کے دفاتر کو جلا کر راکھ کا ڈھیر نہ بنایا جائے سوزِ عشق پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ مسلک غلط ہے۔

صحیح مسلک یہ ہے کہ عقل و بصیرت کی رُو سے علم حاصل کیا جائے اور اسے وحی کی راہ نمائی کے تابع رکھا جائے۔

اس پر مرشد رومی اور شیخ تبریزی کی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد بابائے صحرائی (اقبالؒ) کے نصیحت نامہ کا بقایا حصہ آتا ہے جسے آئندہ پیش کیا جائے گا۔

اقبال اور قرآن

از: پرویز

علامہ اقبال کے پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ

ضخامت ۲۵۶ صفحات ——— قیمت دو روپے

سلسلۂ اصلاح وتذکیر (محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

(۸)

[اس مضمون کی گذشتہ پانچ اقساط میں یہ بتایا گیا تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ اور والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ، نیز بھائی بہنوں کو آپس میں کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں ہر ایک کے فرائض وواجبات کیا ہیں ؟ اس کے بعد چھٹی اور ساتویں قسط میں یہ بتایا گیا کہ میاں بیوی کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے؟ اور ان کے ایک دوسرے پر کیا حقوق وواجبات ہیں۔ لہٰذا ان کو آپس میں کس طرح رہنا چاہیئے۔ یہ عنوان ہنوز جاری ہے۔ طلوع اسلام]

میاں بیوی

شادی کی غرض وغایت

قرآن کی نگاہ میں شادی کی سب سے بڑی غرض وغایت اطمینان وسکون کا حاصل ہونا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا .... (۷/۱۸۹)

خدا وہ ہے جس نے تمہیں ایک نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اسی نفس واحدہ سے اس کا جوڑ بنایا تاکہ وہ اس کی طرف سکون واطمینان حاصل کرسکے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے زَوْجٌ کا لفظ عربی زبان میں جیسا کہ مرد کے لئے بولا جاتا ہے اسی طرح عورتوں کے لئے بھی بولا جاتا ہے قرآن کریم نے بھی اس لفظ کو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ مرد عورت کے لئے جوڑا ہوتا ہے۔ ایسے ہی عورت بھی مرد کے لئے جوڑا ہوتی ہے۔ لہٰذا جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا میں زَوْجَهَا سے مراد بیوی ہی نہیں ہے بلکہ شوہر بھی ہے۔ اس لئے آیت کا

مطلب یہ ہوا کہ خدا نے انسان کو ایک نفس واحدہ سے پیدا کیا ہے اور اسی نفس واحدہ سے اس کا جوڑ بھی بنایا ہے۔ تاکہ ہر انسان اپنے جوڑے سے سکون و اطمینان حاصل کر سکے۔ اسلئے جہاں ہر عورت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کو سکون و اطمینان کی دولت عطا کیے وہیں ہر مرد کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو سکون و اطمینان کی دولت مہیا کرے۔ فریقین کا یہ فریضہ ہے کہ وہ فریق ثانی کے لئے سکون و اطمینان مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جہاں محسوس ہو کہ دوسرے فریق کو (خواہ وہ شوہر ہو یا بیوی) اس سے مطلوبہ سکون و اطمینان میسر نہیں آرہا ہے وہیں اسے محسوس کر لینا چاہیئے کہ وہ شادی کی غرض و غایت کو پورا نہیں کر رہا ہے اور اپنے طرز عمل میں فوری طور پر ایسی تبدیلی کر لینی چاہیئے جس سے شادی کی یہ غرض و غایت باحسن وجوہ پوری ہو سکے۔

افزائش نسل

شادی کا دوسرا مقصد افزائش نسل ہے۔ افزائش نسل یوں تو بغیر شادی کے بھی ممکن تھی، کیونکہ مرد اور عورت میں ایک دوسرے کی طرف کشش اور جاذبیت ایک فطری تقاضا ہے اور اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے طرفین باہمی اتصال کے خواہاں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس تقاضے کو بے مہار چھوڑ دیا جائے تو اس طرح جو نسل پیدا ہوگی وہ کسی ضابطہ اور قانون کے ماتحت پیدا نہیں ہوگی جس کی وجہ سے معاشرے میں جنسی ابتری پھیل جائے گی اسلئے قرآن کریم نے اس کے لئے کچھ حدود و قیود مقرر کر دی ہیں تاکہ معاشرے میں کسی قسم کی ناہمواری اور گڑبڑ پیدا نہ ہو سکے۔ جن عورتوں سے ایک مرد کے لئے شادی کرنا جائز نہیں ان کا بیان کرنے کے بعد قرآن کریم کہتا ہے۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ...... (۴/۲۴)

ان (مذکورہ بالا) عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں کہ مہر میں اپنے مال ان کو دے کر ان سے نکاح کر سکو۔ مگر یہ نکاح (نطفہ) کی حفاظت کرنے کے لئے ہو اسے بہانے کے لئے نہ ہو۔

اس آیت میں مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔ یہ دونوں لفظ قرآن کریم نے مردوں ہی کے لئے نہیں بلکہ عورتوں کے لئے بھی استعمال کئے ہیں۔ چنانچہ اس سے اگلی آیت (۴/۲۵) ہی میں مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ کے لفظ موجود ہیں۔

محصنین اور محصنٰت دونوں لفظ حصنٌ سے مشتق ہیں جس کے معنے محفوظ اور مستحکم ہونا ہیں۔ اسی وجہ سے قلعہ کو حصن کہتے ہیں کیونکہ وہ محفوظ مقام ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں فرمایا ہے وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (۲۱/۸۰) (اور ہم نے داؤد کو تمہارے لئے زرہ بکتر بنانا سکھایا تاکہ وہ جنگ میں تمہاری حفاظت کر سکیں) اِمْرَأَةٌ حَصَانٌ عفیف اور پاک دامن عورت کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی عفت و عصمت کو محفوظ رکھتی ہے۔ اَحْصَنَتِ الْمَرْأَةُ اس وقت کو کہتے ہیں جب عورت حاملہ ہو جائے کیونکہ وہ اپنے رحم میں نطفہ کو محفوظ رکھ لیتی ہے۔ اَلْحَوَاصِنُ حاملہ عورتوں کو کہتے ہیں۔ لہذا مُحْصِنٌ اور مُحْصِنَةٌ کے معنی نطفہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورت کے ہونگے۔

مُسٰفِحِيْنَ اور مُسٰفِحَاتٌ دونوں لفظ سَفْحٌ سے مشتق ہیں جس کے معنی بہانے اور ضائع کرنے کے ہوتے ہیں سَفَحَتُ

اَلْمَاءَ کے معنی ہیں میں نے پانی کو بہا دیا سَفَحَ الدَّمَ کے معنے ہیں اس نے خون کو بہا دیا دَمٌ سَافِحٌ اور دَمٌ مَّسْفُوحٌ بہتے ہوئے خون کو کہتے ہیں دَمْعٌ سَافِحٌ بہتے ہوئے آنسو کو کہتے ہیں۔ لہذا مُسَافِحِیْنَ اور مُسَافِحَاتٌ کے معنے مادہ منویہ کو بہانے والے مرد اور عورت کے ہوں گے۔

لہذا مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ شادی عفت و عصمت کے علاوہ اپنے مادہ منویہ کی حفاظت کے لئے کی جانی چاہیئے۔ محض شہوت رانی اور جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے نہیں۔ لہذا شادی کا مقصد مادہ منویہ کو بہانا نہیں بلکہ اسے محفوظ مقام یعنی رحم زوج میں منتقل کر دینا ہے۔ تاکہ وہ وہاں سے مناسب اور ضروری نشوونما حاصل کر کے ایک جیتے جاگتے بچہ کی صورت میں پیدا ہو سکے۔

لہذا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عورت جذبہ جنسی کی تسکین کا ذریعہ ہے اور شادی کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ ذریعہ قانون اور شریعت کی رو سے جائز قرار پا جاتا ہے وہ شادی کی غرض و غایت سے قطعاً بے خبر ہیں۔ شادی سے مراد محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں بلکہ تخم انسانی کی حفاظت ہے۔

مروجہ برتھ کنٹرول برتھ کنٹرول کے لئے ایسے آلات کا استعمال کرنا جو مانع استقرار حمل ہوں یا اور کوئی چیز مثل ادویہ وغیرہ استعمال کرنا (جہاں تک میں سمجھتا ہوں) اس آیت کی بنا پر جائز نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے سے یہ لوگ خود ہی اس کا ثبوت بہم پہنچا دیتے ہیں کہ میاں بیوی کے باہمی اتصال کا مقصد استقرار حمل نہیں بلکہ محض شہوت رانی ہے۔ وہ اپنے مادہ منویہ کو محفوظ مقام پر حفاظت کے لئے نہیں پہنچاتے بلکہ اس کو بہاتے اور ضائع کرتے ہیں۔ لہذا یہ لوگ مسافحین کے زمرہ میں شامل ہیں نکاح کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ انسانی نطفہ کو ضائع ہونے سے بچایا جائے اور اس کو محفوظ کر لیا جائے۔ شادی شدہ مرد کو محصن اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے مادہ منویہ کو محفوظ کرنے والا ہوتا ہے اور شادی شدہ عورت کو محصنہ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اس مادہ منویہ کی حفاظت کا محل اور مقام ہوتی ہے (محصنۃ اسم ظرف مونث ہے) لہذا جو لوگ باوجود شادی شدہ ہونے کے اپنے نطفوں کو ضائع کرنے کی کوششیں کرتے ہیں وہ نکاح کے مقصد اولیٰ سے پہلو تہی کرتے اور اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے سے آنکھیں چراتے ہیں۔ ایسے لوگ قرآن کی اصطلاح مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ میں ہرگز داخل نہیں ہیں۔

یقیناً اس قسم کے حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ کسی وقت قرآنی معاشرہ برتھ کنٹرول کو ضروری سمجھے اور بے تحاشا افزائش نسل کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی ضرورت پیش آجائے ایسی صورت میں اگر معاشرہ اس قسم کا حکم دے تو برتھ کنٹرول ضروری ہوگا مگر اس کا طریقہ ضبط نفس (SELF CONTROL) ہونا چاہیئے۔ نہ کہ اس قسم کے طریقے جو مسافحین کے ماتحت آجانے کے علاوہ نہ معلوم کن کن اعصابی اور نفسیاتی امراض کا موجب بنتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے دوسرے مقام پر عورتوں کو حَرْثٌ (کھیتی) سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا ہے

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ (۲/۲۲۳)

تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ لہٰذا جب تم چاہو اپنی کھیتیوں میں آ سکتے ہو۔

اس آیت سے واضح ہے کہ قرآنی نقطۂ نظر سے جنسی تعلق کا مقصد افزائش نسل ہے۔ لہٰذا بیوی سے قربت کے وہی طریقے جائز ہو سکتے ہیں جو افزائش نسل کا موجب ہوں۔ جن طریقوں سے استقرار حمل نہیں ہوتا اور محض مادۂ منویہ کا بہانا مقصود ہوتا ہے وہ طریقے جائز نہیں ہوں گے۔ لہٰذا وہ تمام غیر فطری طریقے جو نسل کشی سے بچنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی ان آیات کی رو سے ناجائز ہوں گے۔

متعہ

بعض اسلامی فرقے متعہ کے جواز کے قائل ہیں اور اگرچہ دوسرے فرقے اس کو جائز نہیں سمجھتے مگر پھر بھی ان کی کتابوں میں ایسی روایتیں ملتی ہیں جن سے متعہ کے جواز کی سند ملتی ہے اور یہ لوگ ان روایات کو منسوخ کہہ کر اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن وہ اگر قرآن کریم کی ان آیات پر غور کریں تو انھیں یہ سمجھنے میں یقیناً کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کہ متعہ کا تصور ہی قرآنی روح کے خلاف ہے۔ متعہ (یعنی کچھ معاوضہ دے کر مدت مقررہ تک کے لئے نکاح کر لینا) کی غرض و غایت محض شہوت رانی ہوتی ہے۔ استقرار حمل اور افزائش نسل نہیں ہوتی۔ اس لئے اس نکاح کو نکاح کہنا ہی غلط بلکہ نکاح کی توہین ہے لہٰذا یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ رسول اللہ صلعم نے کسی وقت بھی ایسے خلاف قرآن فعل کی اجازت دی ہوگی۔ اور قرآن کی ان آیات کے موجود ہوتے ہوئے اس کو آج بھی جائز سمجھنا بہت بڑی جسارت ہے۔ اس سے ہمارا مقصود کسی خاص فرقہ کی مخالفت نہیں مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن کی رو سے اس باب میں صحیح پوزیشن کیا ہے

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہے کہ قرآنی نقطۂ نظر سے شوہر اور بیوی کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے۔ اس کے بعد اب یہ دیکھئے کہ شادی کے رشتہ میں منسلک ہو جانے کے بعد ایک شوہر اور بیوی کو آپس میں کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔

محبت و رحمت کا تعلق

قرآن اس سلسلہ میں جو ہدایات دیتا ہے اس سے نظر آتا ہے کہ اس کی نگاہ میں میاں بیوی کے تعلقات، محبت اور مودت اور ساتھ ہی رحمت کے ہونے چاہئیں۔ مودت قلبی لگاؤ اور دلی محبت کو کہتے ہیں اور رحمت اس قسم کی شفقت و مہربانی کو کہتے ہیں جیسا کہ رحم مادر میں پرورش پانے والے جنین کے لئے اس کی ماں کی طرف سے ظہور میں آتی ہے۔ سورۂ روم میں ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

یہ بات بھی خدا کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے خود تم ہی میں سے تمہارے جوڑے پیدا کر دیئے۔ تاکہ تم ان کی طرف سکون و اطمینان پا سکو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت کا رشتہ قائم کر دیا۔

اس بات میں سوچنے والے لوگوں کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

لہٰذا تعلق زوجیت قائم ہو جانے کے بعد میاں بیوی کے درمیان اس قسم کا تعلق ہونا چاہیئے جس میں ایک کو دوسرے سے سکون و

اطمینان کی نعمت میسر آسکے۔ اور قلبی لگاؤ اور دلی محبت کے ساتھ مرحمت و مہربانی کا ایک دوسرے کے ساتھ سلوک ہوسکے۔ اگر شادی ہو جانے کے بعد کسی میاں بیوی کو یہ چیزیں میسر نہیں آتیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ان کو شادی کا وہ ثمرہ اور پھل ہی نصیب نہیں ہوسکا جو اس تعلق کے بعد ہونا چاہیئے تھا۔ قرآن کریم کی اس آیت کے مخاطب نہ تنہا مرد ہیں اور نہ تنہا عورتیں بلکہ مرد اور عورتیں دونوں ہی اس کے مخاطب ہیں۔ اس لئے شادی کے بعد اپنی اپنی جگہ پر میاں بیوی دونوں کو اپنے دل اور اپنے سلوک کا برابر جائزہ لیتے رہنا چاہیئے اور دیکھتے رہنا چاہیئے کہ اس سلسلہ میں ان میں سے کسی ایک کی طرف سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی۔ اگر کوئی کوتاہی ہو رہی ہے تو اس کے تدارک کی فکر کرنی چاہیئے۔ قرآن کریم کی اس آیت سے یہ چیز صاف ظاہر ہے کہ بیوی اپنے شوہر سے اور شوہر اپنی بیوی سے بطور استحقاق مودت و محبت، رحمت و شفقت اور سکون و اطمینان کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اگر مرد اپنی بیوی کو یہ نعمتیں مہیا نہیں کرتا تو قرآن کی نگاہ میں وہ خطاوار اور مجرم ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی بیوی اپنے شوہر کو ان نعمتوں سے محروم رکھتی ہے تو قرآن کی نگاہ میں وہ بھی مجرم اور قصور وار ہے۔ اس لئے یہ تینوں چیزیں (محبت، رحمت اور سکون) وہ جذبات ہیں جو خدا ہر شوہر اور بیوی میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کسی شوہر اور کسی بیوی کو ان تقاضوں سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

سورۂ آل عمران میں ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ
الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ
وَالْحَرْثِ ط ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ج وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ (۳/۱۴)

آدمیوں کے لئے مرغوبات کی محبت یعنی عورتوں، بیٹوں، سونے چاندی کے انبار کئے ہوئے ڈھیروں، نشان زدہ گھوڑوں، چوپایوں اور کھیتوں کی محبت مزین کر دی گئی ہے۔ یہی حیات دنیوی کا ساز و سامان ہے اور اللہ کے نزدیک اچھا ٹھکانہ ہے۔

ان چیزوں کی کشش انسان کے لئے خوشگوار بنا دی گئی ہے اور چونکہ اسے خود خدا نے خوشگوار بنایا ہے۔ اس لئے اسے مذموم یا معیوب قرار نہیں دیا جا سکتا چونکہ یہ کشش خود منشائے خداوندی کے مطابق ہے اس لئے اگر ہم میں سے کوئی فرد اس کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہا ہے تو وہ مجرم ہے اور اس سے بطور استحقاق اس کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

ناپسندیدہ شادیاں

چونکہ یہ چیزیں ضروری ہیں اور منشائے خداوندی کے مطابق اس لئے ہر میاں بیوی کے درمیان ان کو ضرور موجود ہونا چاہیئے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر شادی کا فعل صحیح طور پر عمل میں آیا ہو تو یہ چیزیں از خود موجود ہو جاتی ہیں۔ جہاں یہ چیزیں (محبت، رحمت اور سکون) موجود نہیں ہوتیں اس کی عموماً دو ہی وجہیں ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ شادی میں لڑکے اور لڑکی کی مرضی کو دخل نہ ہو اور ان کی مرضی کے خلاف یہ شادی عمل میں آئی ہو۔ دوم شوہر اور بیوی کے مزاج میں اس قدر تفاوت ہو کہ وہ باہم مفاہمت کر کے اس گاڑی کو کھینچ ہی نہ سکیں۔ مگر یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے بچا جا سکن

تمہارا ماں باپ اگر اپنے لڑکے یا لڑکی کی شادی ان کی مرضی کے خلاف نہ کرتے بلکہ ان کی مرضی کے مطابق کر دیتے تو یہ صورت یقیناً پیش نہ آتی۔ ایسے ہی اگر دونوں کے مزاج کے متعلق تحقیقات کر لی جاتی اور یہ بے جوڑ شادی عمل میں نہ لائی جاتی تو قطعاً یہ صورت پیش نہ آتی۔ لہٰذا اگر اس میں کوئی قصور ہے تو شادی کے تعلق کا کوئی قصور نہیں بلکہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ ہمارے معاشرہ میں اپنی دو خرابیوں کی وجہ سے ہزاروں گھر جہنم بنے ہوئے ہیں۔ کہیں جبری شادی کر دی گئی ہے کہ لڑکے کی یا لڑکی کی مرضی کو کچل کر سہرا باندھا گیا ہے اور کہیں لڑکے یا لڑکی کے مزاجوں میں اتنا تضاد ہے کہ مفاہمت کی کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ معاشرہ افراد کے گھروں کی ہیئت ترکیبی ہی کا تو نام ہے۔ آج معاشرہ میں جو اس قدر ناہمواریاں ہی ناہمواریاں نظر آتی ہیں اس کی بڑی وجہ ہمارے اپنے اپنے گھروں کی ناہمواری ہے جس قوم کے افراد غیر تسلی بخش اور ناسکون شناس زندگی بسر کر رہے ہوں، اس قوم کے معاشرہ میں سکون و اطمینان کا کہیں نام بھی لیا جا سکتا ہے؟ اس ساری خرابی کی بنیاد محض یہ چیز ہے کہ جس چیز کا فیصلہ ان دو زندگیوں کو کرنا چاہیئے تھا جو اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بھر کے لئے وابستہ کر رہے ہیں اس کا فیصلہ وہ خود دونوں زندگیاں نہیں کرتیں بلکہ ان کے بڑے اور بزرگ کر ڈالتے ہیں۔ جو نہ آنے والی نسل کے صحیح رجحانات کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہ مزاجوں کے تضادات کو سمجھ سکتے ہیں۔

شادی اپنی پسند سے کرنی چاہیئے

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں نکاح کی اجازت دی ہے وہاں مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ کہا ہے (عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں) یہ نہیں کہا کہ عورتوں میں سے جو تمہارے ماں باپ یا دوسرے بزرگوں کو پسند ہوں۔ احادیث میں بھی تاکید کی گئی ہے کہ جس لڑکی سے شادی کر رہے ہو اسے پہلے اچھی طرح دیکھ لو اس کے بعد شادی کرو۔ مگر بُرا ہو ہمارے معاشرہ کی جہالت کا کہ ان تمام تاکیدوں کے باوجود شادی کا عمل ایسا شرمناک عمل سمجھا جاتا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کو اس کے متعلق اپنی زبان کو حرکت دینا بھی خلافِ شرافت سمجھ لیا گیا ہے۔

اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ شادی کا ثمرہ اور نتیجہ سکونِ قلب، اطمینانِ روح، قلبی لگاؤ، دلی محبت اور باہمی رحمت و شفقت ہونا چاہیئے۔ ان چیزوں کے راستے میں جو معاشرتی رسوم حائل ہیں وہ سب غیر قرآنی ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان کو فوراً بند کر دیا جائے۔

بیوی کی محبت قانونِ خداوندی کی اطاعت میں حائل نہیں ہونی چاہیئے

لیکن جیسا کہ بارہا پہلے بھی کہا جا چکا ہے اس قلبی لگاؤ اور باہمی محبت کو قانونِ خداوندی کی اطاعت میں حائل نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر یہ محبت و مودّت اپنی حدود سے آگے بڑھ رہی ہے تو اس کی فوراً روک تھام کر لینی چاہیئے۔ کیونکہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ .... (۶۴/۱۴)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہاری بعض بیویاں اور بعض اولادیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو تمہاری دشمن ثابت ہوں۔ لہٰذا ان سے بچتے رہا کرو۔

ایسی بیوی جو تمہیں حدود خداوندی سے تجاوز پر مجبور کرے اور جس کی وجہ سے تم اقدار خداوندی سے ہم آہنگ نہ رہ سکو تمہارے لئے باعث رحمت نہیں بلکہ موجب ہزار زحمت ہے وہ تمہاری دوست اور خیر خواہ نہیں بلکہ تمہاری دشمن ہے

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوا امۡرَاَتَ نُوۡحٍ وَّ امۡرَاَتَ لُوۡطٍ ؕ کَانَتَا تَحۡتَ عَبۡدَیۡنِ مِنۡ عِبَادِنَا صَالِحَیۡنِ فَخَانَتٰہُمَا فَلَمۡ یُغۡنِیَا عَنۡہُمَا مِنَ اللّٰہِ شَیۡئًا وَّ قِیۡلَ ادۡخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیۡنَ ﴿۶۶/۱۰﴾

ان لوگوں کے لئے جو قانون خداوندی کا انکار کرتے ہیں خدا نے نوحؑ کی بیوی اور لوط کی مثال بیان کی ہے۔ یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے تحت میں تھیں مگر ان دونوں نے ان سے خیانت کی تو یہ دونوں (اولوالعزم پیغمبر) خدا کے عذاب سے ان کو نہ بچا سکے۔ اور ان دونوں بیویوں سے کہہ دیا گیا کہ تم دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ۔

قوم لوط پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے جب تباہی آئی ہے تو فرستادگان خداوندی نے حضرت لوط علیہ السلام کو پہلے ہی جتلا دیا تھا کہ ان کی بیوی بھی ان عذاب میں ہلاک ہوگی۔

قَالُوۡا یٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنۡ یَّصِلُوۡۤا اِلَیۡکَ فَاَسۡرِ بِاَہۡلِکَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ وَ لَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَکَ ؕ اِنَّہٗ مُصِیۡبُہَا مَاۤ اَصَابَہُمۡ ؕ اِنَّ مَوۡعِدَہُمُ الصُّبۡحُ ؕ اَلَیۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِیۡبٍ ﴿۱۱/۸۱﴾

فرستادگانِ الٰہی نے کہا۔ اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں اور آپ اطمینان رکھیے وہ آپ کو کچھ ایذا نہیں دے سکیں گے۔ آپ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے کسی حصہ میں نکل جایئے۔ اور تم میں کوئی مڑ کر ادھر ادھر نہ دیکھے۔ البتہ آپ کی بیوی کو وہی کچھ عذاب ملے گا جو باقی پوری قوم کو ملے گا۔ ان سے صبح کا وعدہ ہے کیا اب صبح کا وقت قریب ہی نہیں ہے؟

بہرحال بیویوں میں سے بعض بیویاں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو قانون خداوندی کی اطاعت کے راستہ میں سنگِ گراں بن جائیں۔ اگر ہم بیویوں کی محبت میں اندھے بن کر قانون خداوندی کی اطاعت سے رک جائیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے بیوی کی محبت کو اس کی حدود کے اندر نہیں رکھا بلکہ ہم خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر گئے ہیں جو کسی طرح بھی جائز نہیں۔

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہے کہ شادی کا نتیجہ اور ثمرہ قرآنی نقطۂ نظر سے قلبی لگاؤ اور باہمی محبت، سکون و اطمینان باہمی رحمت و شفقت کا سلوک ہے۔ آپ ابتدا مضمون میں یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ نکاح قرآن کی نگاہ میں ہونیوالے میاں اور بیوی کے درمیان جانبین کی رضامندی سے ایک باہمی معاہدہ کا نام ہے۔ قرآن کریم کا منشاء اگرچہ یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اس معاہدہ کو نبھایا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم کا عمومی حکم یہی ہے کہ اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ (۵/۱) معاہدوں کو پورا کیا کرو۔ اور

أَوْفُوْا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۴) معاہدہ کو پورا کیا کرو کیونکہ معاہدہ کے بارہ میں سوال ہوگا۔ لہٰذا حتی الامکان اس معاہدہ کو توڑنے کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ چنانچہ سورۂ نساء میں یہ حکم موجود ہے کہ

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۔ (۴/۱۹)

عورتوں کے ساتھ جانے پہچانے طریقہ پر حسن سلوک کرتے رہو۔ چنانچہ اگر تم انھیں ناپسند بھی کرتے ہو تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کر رہے ہو مگر خدا نے اس میں تمہارے لئے بہت زیادہ خیر اور بھلائی رکھ دی ہو۔

تو قرآن کریم اگرچہ باہمی جدائی کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا لیکن ایسے حالات و واقعات سے چشم پوشی بھی تو نہیں کی جا سکتی کہ جہاں یہ جدائی قطعاً ناگزیر ہو جاتی ہے۔ لڑکے اور لڑکی نے ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے مزاج کا کسی قدر اندازہ بھی ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ شادی اور نکاح کے معاہدہ میں منسلک ہو جاتے ہیں تو بعض اوقات ایسی ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں جن کا اس سے پہلے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں ہزاروں دوستوں سے فریب کھاتے ہیں سالہاسال تک جن لوگوں کو اپنا دوست اور بہی خواہ سمجھتے رہے تھے وہ آخر میں مار آستین نکلتے ہیں تو کیا اچنبھا ہے کہ کوئی میاں بیوی ایک دوسرے کے رفیق صادق نہ بن سکیں۔ اگر ایسی صورت پیش آجائے اور میاں بیوی اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ گذارہ نہیں کر سکتے تو قرآن کی نگاہ میں نکاح کوئی ایسا بندھن نہیں ہے جو کسی طرح بھی توڑے ٹوٹ سکے اور نہ کاٹے کٹ سکے۔ عیسائیت اور ہندومت کی طرح نکاح کا یہ معاہدہ ایسا اٹل نہیں ہے کہ ساری عمر اس کی آگ میں گھٹ گھٹ کر گذار دی جائے اور کسی طرح چھٹکارا ہی نہ مل سکے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے جو طریقہ مقرر کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ

پہلا مرحلہ اگر میاں بیوی کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ باہمی طور پر زندگی بسر نہیں کر سکیں گے حالات کو اعتدال پر لانے کے لئے جس قدر کوششیں ہو سکتی تھیں وہ کر چکنے کے بعد مایوس ہو چکے ہوں تو انھیں یہ چیز معاشرہ کے علم میں لانی چاہئے اور معاشرہ کو بھی اس کا موقع ملنا چاہیئے کہ وہ اصلاح کی کوشش کر سکے۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ شوہر اور بیوی اپنے اپنے طور پر جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ سو فیصدی صحیح ہو۔ بعض مرتبہ شدت جذبات کے ماتحت انسان قوت فیصلہ سے محروم ہو جاتا ہے اور صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت کھو بیٹھتا ہے۔ اس لئے اسے معاشرے سے رجوع کرنا چاہیئے۔

وَاللَّاتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۔۔۔۔۔۔ (۴/۳۴)

جن عورتوں کی نافرمانی کا تمہیں اندیشہ ہو ان کو نصیحت کرو اور سمجھاؤ، انھیں ان کی خوابگاہوں میں (تنہا) چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ پھر اگر وہ کہا مان جائیں تو ان پر اس کے بعد الزام کی راہ تلاش

نہ کرو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس پہلے مرحلہ میں بھی قرآن کریم نے معاشرہ کے لئے تین مرحلے رکھے ہیں اول انہیں چاہیئے کہ وہ نصیحت اور سمجھا بجھا کر حالات کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اگر اس کے بعد بھی حالات درست نہ ہوں تو پھر شوہر کو وہ ہدایت کریں کہ وہ اپنی بیوی کو خوابگاہ میں تنہا چھوڑ دے اور اس سے الگ الگ رہے۔ اگر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو تو پھر عدالت اگر ضروری سمجھے تو بیوی کو جسمانی سزا بھی دے سکتی ہے۔ اگر اس کے بعد وہ راہ پر آجائیں تو پھر ان پر مزید کسی زیادتی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ تمام تدابیر ناکام ہو جائیں اور تعلقات کسی طرح درست نہ ہوں تو پھر دوسرا مرحلہ اختیار کیا جائے۔

دوسرا مرحلہ

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا ۚ إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ۝ (۴/۳۵)

اگر تمہیں ان دونوں (میاں بیوی) کے درمیان مخالفت کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث شوہر کے خاندان سے اور ایک ثالث بیوی کے خاندان سے مقرر کر دو (یہ دونوں مل کر اصلاح حال کی کوشش کریں) اگر ان دونوں نے اصلاح حال کی نیت رکھی تو خدا ان دونوں کے درمیان اس کی توفیق دیدے گا۔ بلاشبہ خدا سب کچھ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

دوسرے مرحلہ میں معاشرہ ان کا معاملہ دو ثالثوں کے سپرد کر دے گا۔ ان میں سے ایک ثالث شوہر کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوگا۔ اور دوسرا ثالث بیوی کے خاندان سے ہوگا۔ وہ دونوں مل کر اصلاح حال کی کوشش کریں گے۔ اور یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ اگر دونوں کی نیت اصلاح حال کی ہوئی تو انشاء اللہ ان کی مساعی ضرور کامیاب ہوں گی۔ لیکن اگر ان کی کوششیں کوئی نتیجہ پیدا نہ کریں تو وہ معاشرہ کو سفارش کر دیں کہ واقعی ان دونوں کے درمیان نباہ ہونے کی کوئی شکل نہیں ہے۔ اس لئے ان کا وہ معاہدہ جو ان دونوں نے نکاح کی صورت میں کیا تھا ختم کر دیا جائے۔ معاہدۂ نکاح کے اس عمل فسخ کو قرآن طلاقؔ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے جس کے معنی کھول دینے کے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ قرآن کریم نے نکاح کو عقدۃ النکاح (نکاح کی گرہ) کہا تھا۔ طلاق اس گرہ کو کھول دینا ہے۔ یعنی اس معاہدہ کو ختم کر دینا۔

تیسرا مرحلہ

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ۖ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ۗ (۲/۲۲۹)

طلاق کا عمل دو مرتبہ ہو سکتا ہے جس کے بعد بیوی کو جاتے ہوئے پسندیدہ طریقہ پر روک بھی سکتے ہیں اور عمدگی کے ساتھ رخصت بھی کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم کی اس آیت نے بتا دیا کہ طلاق کا یہ عمل دو مرتبہ تو اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد شوہر کو یہ حق باقی رہتا ہے کہ وہ طلاق سے

رجوع کرلے۔ اور بیوی کو پھر معروف طریق سے اپنی زوجیت میں واپس لے لے۔

پہلی مرتبہ عمل طلاق ہو جانے اور پھر واپس لینے کے بعد اگر پھر دوبارہ اس قسم کے حالات دو اتفاقات پیش آئیں جیسا کہ پہلے پیش آئے تھے تو پھر وہی مراحل طے کئے جائیں گے جو پہلی مرتبہ طے کئے گئے تھے۔ اور اگر دوسرا مرحلہ گذر جانے کے بعد فریقین کے خاندانوں کے دونوں ثالث پھر معاشرہ کو یہی سفارش کریں کہ واقعی ان دونوں کے نباہ کی کوئی صورت نہیں ہے تو ایک مرتبہ پھر طلاق کا عمل دہرایا جاسکتا ہے اور اس کے بعد پھر شوہر کو یہ حق رہتا ہے کہ وہ طلاق سے رجوع کرکے اپنی بیوی کو پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لے۔ لیکن ازدواجی زندگی میں دوسری مرتبہ طلاق کا عمل ہو جانے اور بیوی کو واپس لے لینے کے بعد ان دونوں کو اب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ان کو ایک آخری موقعہ (CHANCE) مل رہا ہے اس لئے اب کی مرتبہ وہ کوئی ایسی بات نہ ہونے دیں کہ تعلقات پھر خراب ہو جائیں۔ اور توی امید بھی یہی ہے کہ اب ایسی نوبت نہیں آئے گی۔ کیونکہ دو مرتبہ دھکا لگ جانے کے بعد یقین ہے کہ دونوں کے دماغ ٹھکانے آگئے ہوں گے۔ لیکن اگر اس مرتبہ رجوع کے بعد بھی حالات درست نہ ہوں اور پھر اس قسم کے حالات رونما ہونے شروع ہو جائیں تو معاملہ پھر انہی مراحل سے گذرے گا۔ جن سے پچھلی دو مرتبہ گذر چکا ہے۔ اس دفعہ بھی اگر جانبین کے خاندانوں کے ثالث یہی سفارش کرنے پر مجبور ہوں کہ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان نباہ ناممکن ہے۔ اس لئے ان کا معاہدہ نکاح ختم کر دیا جائے تو تیسری مرتبہ طلاق کے عمل کی نوبت آجائے گی۔ اب اس کے بعد یہ جدائی حتمی ہو جائے گی۔ اور پھر یہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے نہیں رہ سکیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عورت جس دوسرے مرد سے شادی کرے وہ فوت ہو جائے یا جدائی کے ان تمام مراحل مذکورہ سے گذرنے کے بعد (جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) اسے اس دوسرے شوہر سے بھی طلاق ہو جائے۔

> فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يَتَرَاجَعَا إِن ظَنَّا أَن يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ..... (۲۳۰/۲)
>
> اس کے بعد بھی اگر شوہر نے (تیسری مرتبہ) اس کو طلاق دیدی تو اب یہ عورت اس کے لئے اس وقت تک حلال نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے آدمی سے نکاح نہ کرے اس کے بعد اگر یہ دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے تو اس کے بعد ان پر کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ پھر لوٹ آئیں (اور دوبارہ باہم شادی کرلیں) بشرطیکہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ دونوں اب حدود الٰہی کو قائم رکھ سکیں گے۔

تفصیل بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم نے طلاق کے لئے کیا طریقہ تجویز کیا ہے۔ یعنی میاں بیوی کے لئے دو موقع جدائی کے لیسے ہیں کہ ان کے بعد وہ دوبارہ پھر میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ لیکن تیسرا موقعہ (CHANCE) استعمال کر لینے کے بعد اس کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ کہا ہے۔ اَلطَّلَاقُ اِثْنَانِ یا اَلطَّلَاقُ طَلَاقَانِ

نہیں کہا۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ کا مطلب ہی یہ ہے کہ فسخ نکاح کا یہ عمل دو مرتبہ یعنی دو مختلف اوقات میں تو اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد دوبارہ میاں بیوی کے طور پر زندگی بسر کرنے کی گنجائش رہتی ہے۔ لیکن اگر تیسری مرتبہ فسخ نکاح کا یہ عمل پیش آیا تو پھر یہ گنجائش نہیں ہوگی۔ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ طلاق کا مفہوم نکاح کی گرہ کو کھول دینا ہے۔ ایک وقت میں جب بھی یہ گرہ کھولی جائے گی (اس کے لئے طلاق کا لفظ ایک مرتبہ کہنا پڑے یا ہزار مرتبہ) اس کو یہی کہا جائے گا کہ فسخ نکاح کا عمل ایک مرتبہ ہو چکا ہے اور ایک مرتبہ نکاح کی گرہ کھولی دی گئی ہے۔ اس کے بعد اگر عقد کو از سر نو جوڑ لیا جائے۔ اور خواہ آٹھ سال کے بعد پھر اس کی نوبت آجائے کہ معاہدۂ نکاح کو دوبارہ فسخ کیا جائے تو کہا جائے گا کہ دوسری مرتبہ نکاح کی گرہ کھول دی گئی یا عقد نکاح کو فسخ کر دیا گیا ہے اگر زید بکر سے کوئی معاہدہ کرتا ہے اور دو سال کے بعد وہ اس معاہدہ کو فسخ کر دیتا ہے تو اسے عرف اور زبان کے اعتبار سے ایک مرتبہ کا فسخ کرنا ہی کہا جاتا ہے۔ اگر پھر دونوں میں مصالحت ہو جائے اور معاہدہ کو پھر استوار کر لیا جائے لیکن کچھ عرصہ کے بعد پھر اسے فسخ کرنا پڑے تو یہی کہا جاتا ہے کہ زید اور بکر کا فلاں معاہدہ اب دوسری مرتبہ فسخ ہو گیا ہے۔ پہلی مرتبہ میں زید نے فسخ معاہدہ کے الفاظ اگر ہزار مرتبہ بھی دہرائے ہوں تو محض الفاظ کے دہرانے سے یہ نہیں کہا جاتا کہ اس نے ہزار مرتبہ معاہدہ کو فسخ کیا ہے۔ لہذا الطلاق مرتان کا لفظ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ عقد نکاح کو فسخ کرنے کا معاملہ جس کا یہاں بیان ہو رہا ہے۔ دو مختلف اوقات میں ہے۔ ایسے ہی تیسری مرتبہ کا فسخ نکاح کسی تیسرے وقت میں ہے۔

الطلاق سے مراد عقد نکاح کو فسخ کرنے کا عمل ہے نہ کہ لفظ طلاق کہنا۔ بد قسمتی سے ہمارے علمائے کرام نے یہاں الطلاق سے مراد طلاق کا لفظ بولنا لے لیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ طلاق کا لفظ ایک مرتبہ بولا جائے تو ایک طلاق ہو جاتی ہے اور دو مرتبہ طلاق کا لفظ بولنے سے دو طلاقیں ہو جاتی ہیں اور تین مرتبہ یہ لفظ دہرا دینے سے تین طلاقیں پڑ جاتی ہیں۔ لہذا اگر کوئی شخص ایک ہی وقت میں اس لفظ کو تین مرتبہ دہرا دے تو اس کی بیوی ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو جائے گی اور اس سے وہ اس وقت تک شادی نہیں کر سکے گا۔ جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے شادی کر کے اس سے بھی علیحدہ نہ ہو جائے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ یہ تین دفعہ کی طلاق تین مہینوں میں۔ ایک ایک مہینے کے وقفے سے پوری کی جائے گی لیکن جیسا کہ آپ نے سابقہ تصریحات سے دیکھ لیا ہے نہ یہ تصور قرآن کے مطابق ہے اور نہ ہی پہلے گروہ کا خیال۔ یہ دونوں طریقے قرآن کے خلاف ہیں۔

رخصتی سے پہلے طلاق

اگر نکاح کا معاہدہ عمل میں آچکا ہے اور اس کے بعد کچھ ایسی باتیں سامنے آئیں جن سے یہ اندازہ ہوا کہ میاں بیوی کا نباہ نہیں ہو سکیگا۔ تو اس مرحلہ پر بھی جدائیگی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں شوہر کو نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔ البتہ اگر بیوی یا اس کا وکیل یہ نصف مہر معاف کر دے تو معاف کر سکتے ہیں۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ط وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ط وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ط إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ٥ (۲/۲۳۷)

اگر تم نے اپنی بیویوں کو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دی ہو اور تم ان کے لئے مہر مقرر کر چکے ہو تو جتنا کچھ مہر مقرر کیا گیا تھا ان کا نصف ان کو ادا کر دو۔ البتہ اگر وہ یہ نصف مہر خود ادا کر دیں یا وہ شخص ادا کرے جس کے ہاتھ میں (وکالتاً ان کی طرف سے) نکاح کا معاہدہ کرنا ہو تو کر سکتے ہیں بلکہ اس نصف مہر کو معاف کر دینا قانون خداوندی سے ہم آہنگ رہنے کے زیادہ قریب ہے۔ اور تمہیں آپس میں مہربانی کو نہیں بھولنا چاہیئے۔ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے خوب جانتا ہے۔

البتہ اگر ایسی صورت پیش آئے کہ تم نے ان کا مہر ہی کچھ نہ مقرر کیا ہو تو نصف مہر کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوگا۔ ایسی صورت میں دستور کے مطابق کچھ خرچ انہیں دے دینا چاہیئے۔ اس کا کوئی معیار مقرر نہیں ہے یہ شوہر کی مالی حالت سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر شوہر کی مالی حالت اچھی ہے تو اس کی مقدار اس کے مطابق ہوگی۔ اگر اس کی مالی حالت خراب ہے تو پھر اس کی مقدار اسکے مطابق ہوگی۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ج وَمَتِّعُوهُنَّ ج عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ ج مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ج حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ٥ (۲/۲۳۶)

تم پر کوئی حرج نہیں اگر تم عورتوں کو انہیں ہاتھ لگانے اور ان کے لئے کچھ مہر کے طور پر مقرر کرنے سے پہلے ہی طلاق دے دو۔ ایسی صورت میں انہیں کچھ خرچ دیدیا کرو۔ وسعت والے کے ذمے اس کے مطابق ہے اور تنگدست آدمی کے ذمہ اس کے مطابق ہے۔ یہ خرچ دستور کے مطابق دینا چاہیئے۔ ایسا کرنا نیکوکار لوگوں کے لئے ضروری ہے۔

قرآنی فیصلے

۴۰۸ صفحات ــــــ قیمت:- چار روپے

تھکانے والے کام (اور تھکانے والے کھیل) بہت سی محفوظ
طاقت چاہتے ہیں جو معمولی خوراک سے حاصل نہیں ہوتی
ایسے مشاغل والوں کو اوولٹین ضروری فاضل غذائیت بہم
پہنچاتی ہے جس سے جسم دماغ اور اعصاب تقویت پاتے ہیں اگر
آپ روزانہ زندگی چست اور خوش آئند طریق پر گذارنا چاہتے ہیں
تو اسکے لئے بہترین سامان اوولٹین ہی مہیا کرتی ہے۔

طاقت اور توانائی کے حصول کیلئے خوش ذائقہ

اوولٹین استعمال کیجئے

OVALTINE

تقسیم کنندگان:۔ گریہم ٹریڈنگ کمپنی۔ (پاکستان) لمیٹڈ کراچی اور چٹاگانگ

ہماری اپنی عظمتِ پارینہ کے زرّیں اوراق

تاریخِ اسلام ۔ حصّہ اوّل و حصّہ دوم

مصنفہ :- مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

ان جانبازوں، مجاہدوں اور حکمرانوں کی داستان، جنھوں نے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو کچل ڈالا۔ جنھوں نے یونان و روما کی جابر قوتوں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ جنھوں نے قوموں کی تاریخیں بدل ڈالیں۔ جنھوں نے ساری دنیا کو نیا معاشرہ، نئی تہذیب اور نیا تمدن دیا۔

ایسی مسلمان قوم کی مفصل اور مستند تاریخ، عروج و زوال کی داستان، عہد بہ عہد کی کہانی۔ جسے مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کے حقیقت طراز اور سحر نگار قلم نے بیان کیا۔ انداز نگارش بیباک، اسلوب بیان دلکش، واقعات صحیح اور مستند، مبنی بر حقائق، اردو زبان کو اس تاریخ پر فخر ہے۔

صفحات حصہ اوّل ۵۹۲ ۔ صفحات حصہ دوم ۶۷۲ بڑی سائز۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ مجلد قیمت فی حصہ بارہ ۱۲ روپے۔ دونوں حصوں کی قیمت چوبیس ۲۴ روپیہ

ملنے کا پتہ :- چوہدری اقبال سلیم گاہندری، مالک نفیس اکیڈیمی۔ بلاسس اسٹریٹ ۔ کراچی ۲

تین نئی کتابیں

۱۔ اطاہرہ کے نام خطوط

قارئین کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ طاہرہ کے نام خطوط کا مجموعہ بھی اب پریس میں ہے۔ پڑھنے والوں کی سہولت کی غرض سے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ حصہ اول میں تربیب سترہ خط ہیں حصہ دوم میں بقایا خطوط اور ان کے ساتھ میرج کمیشن کے سوالنامہ کا جواب اسکے بعد ایک نہایت مفید باب ہے۔ محترم پرویز صاحب نے قرآن کریم کے ان تمام احکامات کو جو عورتوں (عائلی زندگی) سے متعلق ہیں۔ مختلف عنوانوں کے تحت مربوط مضامین کی شکل میں یکجا کیا ہے۔ یہ تمام مضامین اس باب میں آگئے ہیں اس اعتبار سے کتاب ایک نادر مجموعہ بن گئی ہے جسکی روشنی میں ہماری بچیاں اور بہنیں اپنے حقوق و فرائض کے متعلق وہ سب کچھ معلوم کریں گی جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ ہر حصہ قریب سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہوگا اور قیمت فی حصہ دو اڑھائی روپے کے درمیان۔ اپنی فرمائش جلد بھیجئے۔

۲۔ برقِ طور

جوئے نور کے بعد برقِ طور شائع ہو رہی ہے جسمیں حضرت موسیٰ سے لیکر حضرت زکریا سے قبل تک تمام انبیائے بنی اسرائیل کا تذکرہ جلیلہ آگیا ہے یہ کتاب اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اسمیں قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین داستانِ بنی اسرائیل کی شکل میں ابھر کر سامنے آجاتے ہیں صفحات قریباً سات سو

۳۔ تاریخ الامت حصہ ششم

یہ کتاب ایک عرصے سے پریس میں رکی ہوئی تھی۔ جسے اب چھپ گئی اور شائع ہوگئی ہے اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں حصہ کی اشاعت سے تاریخ الامت کے سلسلہ کی تکمیل ہو جائے گی۔

یہ تینوں کتابیں پیشگی خریداران کی خدمت میں از خود بھیجدی جائیں گی بجز ان حضرات کے جو اس امر کی اطلاع دیدیں کہ انھیں فلاں کتاب درکار نہیں۔ باقی حضرات اپنی اپنی فرمائشیں جلد بھیجدیں۔ ان کی تعمیل فرمائشیں موصول ہونے کی ترتیب سے کی جائیگی۔ (ناظم ادارہ طلوع اسلام ۳/۱۵۹۔ ایل (پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹)

حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گِل
آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما

وقار الملک

(محترم غلام رسول صاحب مہر)

[جنوری ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں، رسالہ نقوش کے شخصیات نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ جملہ مجلہ محترم غلام رسول صاحب مہر کا مقالہ، نواب وقار الملک سے متعلق ہے۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ قارئین طلوع اسلام سے اس کا تفصیلی تعارف بعد میں کرایا جائے گا۔ چنانچہ وہ مقالہ، نقوش اور مہر صاحب کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ جسے ہم شخصیت (PERSONALITY) کہتے ہیں۔ اس میں سیرت و کردار کی جھلکیاں کس طرح جھلمل جھلمل کرتی نظر آتی ہیں۔ نواب وقار الملک کی زندگی کے جو چند واقعات مقالہ میں درج ہیں انھیں غور سے دیکھئے اور پھر سوچئے کہ ہم نے جو لکھا تھا کہ ہمارا دور اشخاص کا دور گیا ہے شخصیتوں کا دور گذر چکا ہے؛ وہ کس قدر صحیح تھا۔

ناممکن ہے کہ وقار الملک کا تذکرہ سامنے آئے اور سرسید کی یاد تازہ نہ ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سرسید کی نگہ جوہر شناس کا کمال تھا کہ اس نے ناسازگاریِ حالات کی مٹی میں ملے ہوئے ان موتیوں کو ایک ایک کرکے تلاش کیا، اپنے دستِ تربیت سے انھیں جھاڑ سنوار کر ایک مالا میں پرو دیا اور پھر اس مالا کو اس انداز سے زمانہ کی گردن میں ڈال دیا کہ ان موتیوں کی چمک دمک سے خود اس کا چہرہ درخشندہ و تابناک ہو گیا۔ اصل یہ ہے کہ ایک بڑا انسان خود ہی انسان نہیں ہوتا بلکہ انسان ساز بھی ہوتا ہے۔ سرسید ایک بڑا انسان تھا۔ بہت بڑا انسان۔ اس لئے انسان ساز بھی۔ وقار الملک اور سرسید کی محفل کے دوسرے "نورتن" اسکی زندہ شہادتیں ہیں آگے بڑھیئے اور وقار الدولہ۔ وقار الملک نواب مشتاق حسین خاں بہادر انتصار جنگ سے ملئے۔ طلوع اسلام]

سرسید مرحوم کے رفیقانِ خاص محض اپنے ہی عہد میں بے مثال نہ تھے بلکہ ان جیسی شخصیتیں کسی بھی عہد میں بہت ہی کم ملیں گی محسن الملک وقارالملک ـ حالی، شبلی، نذیر احمد، اعظم یار جنگ، ان میں کون سی شخصیت ہے جو علم و فضل، مکارم اخلاق، وسعت نظر اور جذبہ خدمت ملک و ملت میں انتہائی اونچے مقام پر فائز نہیں؟ لیکن ان میں سے وقارالملک محاسن کی فراوانی اور فضائل کی جامعیت کے اعتبار سے بہت ممتاز ہیں۔ میں نے شخصیتوں کے اس نظام شمسی پر جب کبھی غور کیا ان میں سے دو کو بالکل یگانہ اور نادر پایا۔ ایک مولانا حالی اور دوسرے نواب وقارالملک۔ مولانا حالی بہت ہی پاکیزہ صفات انسان تھے۔ سراپا سوز و گداز۔ سراپا محبت و شفقت اور سراپا ایثار و انکسار۔ تاہم ان کا حلقۂ عمل صرف علم و ادب اور شعر و سخن تک محدود تھا۔ وقارالملک کا دائرۂ کار بہت وسیع تھا۔ انہوں نے ہر علم پر حسنِ عمل کے جو نقوش چھوڑے ہیں، ان کی آب و تاب اب تک ہر صاحب بصیرت کا دامن نگاہ اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور جب تک فضائل کے اسلامی معیار اس دنیا میں قائم ہیں یہ آب و تاب ماند نہیں پڑ سکتی۔

ان کے انتقال پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے "معارف" میں لکھا تھا:۔

> نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان کا نوحہ کیا۔ مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن دری اور نکتہ سنجی پر آنسو بہائے لیکن نواب وقارالملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گمشدگی پر فریاد۔

یہ احساسات بے شائبہ ریب بالکل سچا اور درست تھے۔

میں نے نواب وقارالملک کو دسمبر سنہ ۱۹۰۸ء میں پہلی اور آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ جب میں غالباً آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ ہوشیارپور میں اسلامیہ ہائی اسکول کا سنگ بنیاد رکھنے کی غرض سے جالندھر سے آئے تھے۔ اس زمانے میں جالندھر اور ہوشیارپور کے درمیان ریلوے لائن نہ تھی اور انہیں جالندھر میں ٹھہر کر گھوڑا گاڑی کے ذریعے سے ہوشیارپور جانا تھا۔ ہزاروں اکابر کے علاوہ طلبا بھی استقبال کے لئے اسٹیشن پر پہنچے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے سب سے مصافحہ کیا۔ میرے ناچیز ہاتھوں کو بھی یہ شرف حاصل ہوا۔ وہ منظر سنتالیس سال گذر جانے کے باوجود اب تک اس طرح آنکھوں کے سامنے تازہ ہے گویا کل پیش آیا تھا۔

قد زیادہ لمبا نہ تھا۔ جسم دوہرا اور گٹھا ہوا۔ اس وجہ سے وہ قدرے پستہ قد نظر آتے تھے۔ رنگ سانولا۔ سر منڈا ہوا۔ چہرہ گول۔ مونچھیں ترشی ہوئی۔ ڈاڑھی متوسط اور بالکل سفید۔ اس وقت ان کی عمر ستر سٹھ کے قریب تھی۔ میں نے جب انہیں دیکھا تو سر پر سرخ ترکی ٹوپی تھی سبز سی گرم شیروانی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ جو بھی ان سے مصافحہ کرتا بڑے تپاک، حسن اخلاق اور محبت و شفقت سے ملتے لیکن چہرے پر متانت کا غلبہ تھا اور تبسم کی کوئی جھلک نمایاں نہ تھی۔

اس زمانے کے استقبال ویسے شاندار نہ ہوتے تھے جن کی رسم ہمارے ملک میں ترک موالات کے دور سے پڑی اور تکلفات میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن جالندھر میں وقارالملک کا استقبال بہت غیر معمولی جوش و خروش اور سرگرمی سے کیا گیا۔ دور تک اور دیر تک ان پر پھولوں

کی بارش ہوتی رہی۔

واضح رہے کہ اُس وقت مجھے وقار الملک کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے مقام بلند کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ لہذا اس تقریب استقبال میں شامل ہونے کی خوش نصیبی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ ہوش سنبھالا تو زندگی کے جن واقعات کو اپنے لئے سرمایۂ فخر سمجھتا رہا ہوں، ان میں ایک یہ واقعہ بھی ہے۔

وقار الملک ۹ محرم ۱۲۵۷ھ (۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء) کو پیدا ہوئے۔ مشتاق حسین نام رکھا گیا۔ والد کا نام فضل حسین تھا۔ ذات کمبوہ وطن سنبھل۔ والدہ امروہہ کی تھیں۔ مشتاق حسین صرف چھ مہینے کے تھے جب ان کے والد نے وفات پائی۔ والدہ یتیم بچے کو لے کر امروہہ آ چلی گئیں اور یہی مقام مشتاق حسین کا وطن بن گیا جو آگے چل کر وقار الدولہ وقار الملک نواب مشتاق حسین خاں بہادر انتصار جنگ بننے والے تھے۔

چھ سال کی عمر میں قرآن ختم کیا۔ کچھ عربی فارسی پڑھی۔ ۱۸۵۹ء میں دس روپے ماہانہ پر مدرس بن گئے۔ پھر انکم ٹیکس کی محرری اور واصل باقی نویسی کی۔ بعد ازاں منصفی میں سررشتہ دار بن گئے۔ تحصیلداری کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ لیکن ایک واقعہ کے باعث جس کا ذکر آگے آئے گا ملازمت سے استعفٰے دیدیا اور سرسید کی سفارش پر ریاست حیدر آباد میں چار سو روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ وہاں سے بھی ایک مرتبہ بعض مقامی کشمکشوں کے باعث ملازمت سے جواب مل گیا تھا۔ دوبارہ بلائے گئے اور تھوڑی ہی دیر میں صوبہ ورنگل کے صوبہ دار پھر معتمد عدالت وکوتوالی بنے۔ سر آسمان جاہ بہادر کی وزارت میں پوری ریاست کا کاروبار عملاً انھیں سے متعلق ہو گیا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں پنشن لے کر وطن واپس آئے اور قوم کے تعلیمی و سیاسی کاموں میں حصّہ لیتے رہے۔ انہی کی کوشش سے مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ نواب محسن الملک کی وفات پر علی گڈھ کالج کے سکرٹیری بن گئے۔ انھیں کے عہد نظامت میں مسلم یونیورسٹی کی تجویز بروئے کار آئی۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں ضعف اور علالت کے باعث استعفٰے دے دیا۔ لیکن قوم کے سیاسی مقاصد سے دلچسپی آخری دم تک جاری رہی۔ ۲۷ اور ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کی درمیانی شب میں پونے دس بجے وفات پائی اور امروہہ میں دفن ہوئے۔

یہ حالات زندگی کا سرسری مرقع ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ ان کے حالات تفصیلاً لکھوں۔ بلکہ ان اولوالعزمانہ اخلاق کی چند جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں جو وقار الملک کی عظمت کا سرچشمہ تھے۔ اور جن کی بنا پر حق شناسوں کے نزدیک ان کا ماتم قوم کا ماتم قرار پایا۔

وقار الملک نے ۱۸۵۹ء میں دس روپے ماہانہ کی مدرسی سے مستقل زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اُس وقت کسی کو اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ اس وجود میں خدا نے کیسی نادر صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ سرسید علی گڈھ میں صدر الصدور کے عہدہ پر مامور تھے۔ جب وقار الملک کو سررشتہ دار عدالت کی حیثیت میں ان کے ماتحت کام کرنا پڑا۔ سرسید علی گڈھ سے تبدیل ہو کر بنارس گئے تو وقار الملک کی سروس بک میں انھوں نے جو رائے لکھی وہ اس عظیم الشان انسان کے گوناگوں اوصاف کا پہلا اعتراف تھا۔ فرماتے ہیں۔

منشی مشتاق حسین سررشتہ دار عدالت ہذا نہایت لائق۔ نہایت محنتی۔ نہایت کارگزار نہایت فہیم

اور نہایت زود نویس و خوش خط افسر ہے۔ اس افسر کی دیانتداری پر مجھ کو ایسا یقین ہے، جیسا کہ اپنی موت پر...... جس عہدے پر یہ شخص نوکر ہے۔ اس سے بہت زیادہ بڑے عہدے کی نہایت عمدہ لیاقت اس میں موجود ہے۔

واضح ہے کہ سرسید حد درجہ متوازن رائے کے آدمی تھے اور ان کی طبیعت میں احتیاط بہت تھی۔ تاہم وہ وقارالملک کے یگانہ اوصاف سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کوئی بھی وصف "نہایت" کی صفت کے بغیر بیان نہ کیا۔ حالانکہ اُس وقت تک وقارالملک معمولی سرشتہ دار تھے اور سرشتہ داری کے محدود دائرے میں ان کی تمام قابلیتیں ٹھیک بروئے کار نہ آسکتی تھیں۔

علی گڈھ کے جج بریلے صاحب بھی وقارالملک کی لیاقت و محنت کے بہت معترف تھے۔ وہ تبدیل ہوئے تو ان کی جگہ مسٹر مارٹن جج مقرر ہو کر آئے۔ انھوں نے طے کر رکھا تھا کہ مسٹر بریلے کی ہر رائے سے اختلاف کریں گے۔ یہاں تک کہ ہر اس شخص کو برا سمجھیں گے جو مسٹر بریلے کی نظروں میں اچھا تھا۔ چونکہ وقارالملک بریلے کی نظروں میں معزز تھے لہذا مارٹن صاحب نے موصوف کی سروس بک میں بے وجہ خراب ریمارک درج کر دیئے۔ وقارالملک کو اپنی راستی کا یقین تھا لہذا مارٹن صاحب سے کہا کہ یا تو ریمارک واپس لے لیجئے یا اس کے وجوہ بتلایئے۔ مارٹن صاحب نے کوئی توجہ نہیں کی تو وقارالملک نے باقاعدہ درخواست پیش کر دی۔ جس میں لکھا:۔

(۱) عدالت کے تمام وکلاء، پولیس عملہ اور حاضرین سے میرا حال دریافت کیا جائے۔

(۲) میں نے اب تک جو کام کیا ہے اُس کا جائزہ لیا جائے۔

(۳) میری تحریر کردہ کیفیتوں سے جن لوگوں کو نقصان پہنچا ہے انھیں بلا کر میرے چال چلن کی صفائی کی تصدیق کر لی جائے یہ طریقہ اگرچہ میرے لئے خطرناک ہے۔ لیکن تحقیقات کی غرض سے میں اس پر بھی راضی ہوں۔

مارٹن صاحب اس پر رضامند نہ ہوئے تو وقارالملک نے کلکٹر کے سامنے درخواست پیش کر دی اور اس میں لکھا۔ "تحقیقات سے جج کا اعراض خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ ریمارک صحیح نہیں۔ تاہم آپ بھی میرے پیش کردہ ذریعوں کے مطابق پوری چھان بین کرالیں۔ ہر طرح اطمینان ہو جائے تو میری سروس بک سے یہ ریمارک قلمزد کر دیا جائے۔"

مشہور مثل ہے کہ :۔ آں را کہ حساب پاک است۔ از محاسبہ چہ باک۔ وقارالملک اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اس کا عملی نمونہ بنے ہوئے تھے۔ ان کا عہدہ جج کے مقابلہ میں بہت چھوٹا تھا۔ تاہم سچی بات میں جج کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے بھی تامل نہ ہوا۔ اور یہ اُس زمانے کی بات ہے جب انگریزوں کے سامنے کسی کو ایک لفظ بھی زبان پر لانے کا حوصلہ نہ تھا ۱۸۶۷ء میں وہ مسٹر کالون کلکٹر کے ماتحت کام کر رہے تھے جب نماز کا وقت آتا مقررہ معمول کے مطابق دفتر سے اٹھ کر مسجد میں چلے جاتے۔ کالون صاحب کو ان کا یہ طریقہ پسند نہ آیا۔ اُس نے منع کیا تو انھوں نے کہا کہ نماز مذہباً مجھ پر فرض ہے میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ البتہ اس کی وجہ سے کام میں کوئی خلل پیدا ہو تو آپ مجھ سے جواب طلب کر سکتے ہیں۔ کالون کام سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف نماز کا مخالف تھا۔ مجبور ہو کر وقارالملک نے درخواست دے دی کہ یا تو ادائے نماز کے لئے تھوڑی سی غیر حاضری معاف

کردی جائے یا غیر حاضری کے وقت کی تنخواہ کاٹ لی جائے یا چھ مہینے کی رخصت دی جائے۔ اگر ان میں سے کوئی صورت منظور نہ ہو تو اس درخواست کو میرا استعفا سمجھ لیا جائے۔

یعنی پندرہ سال کی ملازمت سے دستبرداری پر دھیتے بکلف تیار ہو گئے۔ لیکن نماز میں تاخیر گوارا نہ کی۔

سرسید کو یہ حالات معلوم ہوئے تو وقار الملک کو لکھا۔

> نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے ہو۔ ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو۔ اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی نہ بخشا جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی۔ اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تو پھر للچانا اور گڑگڑانا اور حضور رخصت ہی دیدیں، تنخواہ کاٹ لیں کہنا واہیات تھا۔ تڑاق پڑاق استعفا دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری میسر نہ آتی۔ فاقہ مر جاتے نہایت اچھا ہوتا۔

چھ مہینے کی رخصت کے زمانے میں سرسید نے سر سالار جنگ وزیر اعظم حیدر آباد کو لکھا اور وقار الملک کے لئے حیدر آباد میں چار سو روپے ماہانہ کی ملازمت کا انتظام کر دیا۔ لطف یہ کہ جس انگریز افسر نے نماز پر جھگڑا کر کے رخصت اور استعفے تک نوبت پہنچائی تھی۔ اس نے آپ کی کارکردگی کے متعلق نہایت اچھی رائے دی اور اس میں اقرار کر لیا کہ وہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اپنی رائے بدلنے پر راضی نہ ہوئے میں اس صورت کو قبول نہ کر سکتا تھا۔ اچھا ہوا کہ انھیں دوسری ملازمت مل گئی۔

حیدر آباد میں وہ بہت جلد ترقی کر کے محکمہ عدالت وکوتوالی کے معتمد بن گئے اور ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہو گئی عدالت، کوتوالی کے صدر المہام یعنی وزیر متعلقہ نواب بشیر الدولہ تھے جنھیں بعد میں آسمان جاہ کا خطاب ملا اور وہ مدار المہام بن گئے۔ وقار الملک نے بہت جلد ان کا خاص اعتماد حاصل کر لیا۔ اس زمانے میں میر محبوب علی خاں نظام حیدر آباد کمسن تھے اور انتظام ریاست کے لئے کونسل آف ریجنسی بنی ہوئی تھی۔ جس کے صدر امیر کبیر نواب شمس الامرا تھے۔ وہ نظام کے قریبی رشتہ دار ہوتے تھے بشیر الدولہ ان کے بھتیجے تھے۔ شمس الامرا کو ایک طرف سر سالار جنگ وزیر اعظم سے کاوش تھی دوسری طرف بھتیجے سے مقدمہ بازی کا سلسلہ جاری تھا اور وہ ہر اس شخص کے مخالف تھے جو بشیر الدولہ اور سالار جنگ کے نزدیک معتمد علیہ تھا۔ اس وجہ سے وقار الملک ان کے عتاب کا ہدف بن گئے۔ ایک موقع پر وقار الملک رخصت سے کر وطن جاتے ہوئے گوالیار اترے اور وہاں کے انگریز ریذیڈنٹ کو بشیر الدولہ کا ایک ذاتی پیغام پہنچایا۔ اس بنا پر شمس الامرا کو ناراضگی کے اظہار کا بہانہ مل گیا اور سالار جنگ کو ریاست کے عمومی مصالح کی بنا پر یہی مناسب معلوم ہوا کہ وقار الملک کو ملازمت سے برخاست کر دیں۔

وقارالملک کے لئے یہ واقعہ سراسر تعجب انگیز تھا، لیکن کچھ مدت گزر جانے کے بعد ایک دوست کے ذریعے سے سالارجنگ کی مجبوریوں کا علم ہوا تو بے تکلف لکھ دیا کہ میں اپنے فائدے کے لئے شمس الامراء اور سالارجنگ کے درمیان کسی کشمکش کا روادار نہیں ہوسکتا۔ مجھے اپنی برطرفی بہ دل و جان منظور ہے۔

نواب بشیرالدولہ کو جب اس کا علم ہوا کہ وقارالملک صرف ان کے ایک ذاتی کام کی وجہ سے عتاب میں آئے اور ملازمت گنوائی تو فوراً پیغام بھیجا کہ میں اتنی ہی تنخواہ پر اپنی جاگیر میں ملازم رکھتا ہوں۔ وقارالملک نے لکھ دیا کہ مجھے یہ منظور نہیں۔ اگر سالارجنگ کے سوا کوئی اور مجھے موقوف کرتا تو میں یہ نئی پیشکش قبول کر سکتا تھا۔ جب انہی کی وجہ سے مجھے نوکری ملی اور انہی نے موقوف کیا تو میری محبت اس امر کی متقاضی نہیں کہ میں حیدرآباد میں دوسری جگہ تعلق قبول کروں۔

وقارالملک ملازمت پر آمادہ نہ ہوئے تو نواب بشیرالدولہ نے لکھ بھیجا کہ آپ گھر میں بیٹھے رہیں میں پانسو روپیہ ماہانہ وہاں بھیجتا جاؤں گا۔ وقارالملک نے یہ پیشکش بھی قبول نہ کی اور لکھ دیا کہ میں نے نواب ممدوح کی کوئی ایسی بڑی خدمت انجام نہیں دی جس کے معاوضے میں ان کا اس قدر نقصان جائز سمجھوں۔ آخر بشیرالدولہ نے وقارالملک کی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب پر چار ہزار روپے کی رقم نیوتے کے طور پر بھیج دی۔ وقارالملک نے ایک عزیز دوست کی وساطت سے ضروری سمجھا کہ سالارجنگ سے استصواب کے بغیر یہ رقم قبول نہ کریں۔ وہاں سے جواب آیا کہ روپیہ واپس کردو۔ چنانچہ وقارالملک نے بے تامل واپس کر دیا۔ اس عزیمت عمل پر سر سالارجنگ نے لکھا کہ مولوی مشتاق حسین نے جو کچھ کیا وہ کسی دوسرے سے نہ ہوسکتا تھا۔ امید ہے کہ ایک دن وہ اپنے اس نیک عمل کا صلہ حاصل کریں گے۔

ان واقعات کے بعد سالارجنگ نے خود لکھا کہ میں چار سو روپے ماہ بماہ آپ کو بھیجتا رہوں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ حالات بدل جائیں گے تو آپ کو نعم البدل حاصل ہوگا اور اس امداد کو "بہ صیغۂ راز" رکھیں۔

وقارالملک کو سالارجنگ کا یہ خط ملا تو چار سو روپے کی پیشکش کے سلسلہ میں دو باتیں عرض کیں:۔ اول یہ کہ روپے کی تعداد کم کر دی جائے اسلئے کہ میں کفایت سے گذارہ کر سکتا ہوں۔ دوسرے اسے قرض سمجھا جائے۔ زمانہ میری مساعدت کرے گا تو یہ قرض ادا کر دوں گا۔

سالارجنگ نے چند ہی روز میں سررشتۂ مال کا دستور العمل وقارالملک کے پاس اصلاح و نظرثانی کے لئے بھیجدیا۔ اس طرح ذاتی امداد سرکاری کارگزاری کی شکل اختیار کر گئی۔ اس وقت وقارالملک نے چار سو روپے ماہانہ کی رقم بہ اطمینان خاطر قبول کی۔

وقارالملک اخلاقی جرأت میں ضرب المثل تھے۔ جس زمانہ میں سالارجنگ اعظم دولت آصفیہ کے مختار کل تھے نواب بشیرالدولہ عدالت اور کوتوالی دونوں کے صدرالمہام یا وزیر تھے اور وقارالملک ان کے ماتحت معتمدی (سکریٹری شپ) کے فرائض انجام دے رہے تھے سالارجنگ نے ایک معاملے کے متعلق وقارالملک کے سامنے اپنی رائے ظاہر کی اور فرمایا کہ اسی رائے کو اپنی رائے کے طور پر نواب بشیرالدولہ کے روبرو پیش کردیں۔ وقارالملک اگرچہ سالارجنگ کے آوردہ تھے اپنی ملازمت اور ترقی کو انہی کا احسان سمجھتے تھے لیکن صاف

کہہ دیا کہ میری رائے یہ نہیں۔ سالار جنگ کو یہ امر طبعاً ناگوار گذرا۔ وقار الملک گھر آئے تو فوراً ملازمت سے استعفیٰ پیش کر دیا اور حیدر آباد سے روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ سالار جنگ نے انھیں بلا کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا کہ واقعی اپنی رائے آپ پر ٹھونسنے کا مجھ کو کوئی حق نہ تھا۔

سالار جنگ وفات پا چکے تھے اور بشیر الدولہ سر آسمان جاہ کی مدار المہامی کا زمانہ تھا۔ وقار الملک وقتاً فوقتاً ان سے صاف صاف کہتے رہتے تھے کہ میں کسی خدمت میں حتی الامکان کوتاہی نہ کروں گا۔ لیکن مجھے ریاست میں ملازمت نواب سالار جنگ کی وجہ سے ملی اور میری عقیدت کا پہلا مرجع انہی کا خاندان ہے۔

سر آسمان جاہ بہت نیک دل، نیک مزاج اور شریف انسان تھے۔ بعض اوقات لوگ تملق و خوشامد سے کام لے کر ان سے ایسے احکام جاری کر لیتے، جو انتظامی نقطۂ نگاہ سے مناسب تھے۔ وقار الملک نے ایک عرضداشت ان کی خدمت میں پیش کی اور اس میں صاف صاف لکھ دیا۔

> جن کو چور اور دشمن سمجھتے ہیں، ان کو بھی خدمتوں پر رکھا جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کی کریم النفسی تو ہے یا یہ کہ ان کی خوشامدوں کی خیال کیا جاتا ہے۔ یا طبیعت کی کمزوری ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اول وقت انتظام ضعیف ہوتا ہے۔ دوم انٹریگ (ساز باز) بڑھتی ہے۔ سوم دوسرے عہدہ داروں پر برا اثر پڑتا ہے یہ غلط طرز حکومت ہے اور انصاف کے خلاف ہے۔

وقار الملک سر سید کے بہت معتقد تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ تاہم بیسیوں معاملات میں انھوں نے سر سید کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا۔ یہاں تک کہ ایک معاملہ میں سر سید نے ان کے اختلاف پر ناراض ہو کر لکھ دیا۔

> مجھ کو یقین تھا کہ آپ خدا کے الہام پر بھی اپنی رائے سے منحرف ہونے والے نہیں جیسا کہ میں نے خود آپ کو لکھا تھا۔ کوئی توقع برخلاف اس کے اگر میں کرتا تو میری حماقت تھی۔

کالج کے انتظامات سنبھال لینے کے بعد وقار الملک نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ جس کا اندازہ غالباً عام لوگوں کو نہیں۔ سر سید کے زمانے میں حالات مختلف تھے اور وہ کالج کی ترقی کے پیش نظر انگریز پرنسپل اور انگریز اسٹاف کی دلجوئی میں بہت مبالغہ فرماتے تھے۔ محسن الملک کے زمانے میں انگریزی اسٹاف مختار مطلق بن گیا اور انتظامی معاملات میں سکریٹری یا ٹرسٹی بڑی حد تک بے دست و پا رہ گئے۔ وقار الملک نے چارج لیتے ہی ٹرسٹیوں کی حیثیت بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس پر پرنسپل اور انگریزی اسٹاف نے ایکا کر کے استعفوں کی دھمکی دے دی۔ یوپی کے گورنر نے انگریزی اسٹاف کی تائید کی اور خاصی نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔ وقار الملک نے ٹرسٹیوں کو ہم رائے بنا کر فیصلہ کرایا کہ جب تک انگریز پرنسپل اور انگریزی اسٹاف انتظامی معاملات میں ٹرسٹیوں کی مختاری تسلیم نہ کرے گا اور ملازم کی حیثیت میں نہ رہے گا وہ اطمینان سے نہ بیٹھیں گے۔ چنانچہ انھوں نے بڑی دانشمندی، تدبر لیکن پوری استقامت سے اس معاملے میں کوششیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ گورنر نے اپنی رائے بدل لی۔ اور اسٹاف وقار الملک کی رائے کے مطابق کام جاری رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ کالج کو انگریزی اثرات سے محفوظ کرنے کی یہ پہلی زبردست اور کامیاب کوشش تھی۔

وقارالملک کی سکریٹری شپ کے زمانے میں کالج کی مذہبی فضا بہت خوشگوار ہوگئی۔ انھوں نے ایک موقع پر طلبار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ نماز کی خوبی یا اس کا وجوب یا اس سے اخلاق کی اصلاح کا بیان مقصود نہیں لیکن۔

> یہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس امر کی نگہبانی جہاں تک میری اپنی ذمہ داریوں میں سے اہتم بالشان ہے آپ یہاں کس غرض سے آتے ہیں ؟ ظاہر ہے کہ تعلیم، اخلاق کی اصلاح، اور آداب حاصل کرنے کے لئے۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی توجہ امور دینی کی طرف مائل کردوں ۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیر ہے۔ پرانوں کی جگہ نئے آتے ہیں۔ قومی عمارت کے پرانے ستون رخصت ہوتے جاتے ہیں اور اب یہ بار آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑے گا۔ یہ زمانہ آپ کی تحصیل کا ہے یہی وہ زمانہ ہے کہ آپ اس آئندہ وقت کے لئے تیار ہوں کوشش کیجئے اور سخت کوشش کہ آپ مسلمانوں کے لئے اعلیٰ درجے کا نمونہ ثابت ہوں۔ وہ روش اختیار کیجئے اور ایسے پاک و صاف مذہبی طریقے پر چلئے کہ مسلمان آپ پر بھروسہ کریں۔ حقیقت میں آپ کسی طرح قومی لیڈر نہیں ہوسکتے۔ اگر آپ اسلامی شعار کے پابند نہیں۔

وقارالملک کے پیشتر نماز میں غیر حاضری پر جرمانے کا قاعدہ جاری تھا۔ موصوف نے نماز کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہ قاعدہ منسوخ کردیا اور طلبا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

> اس طرح نماز کا استہزا ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ غیر حاضری مسجد کے لئے اب کوئی سزا نہیں۔ سزا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو صاحب حاضر مسجد نہ ہوں گے اور نماز کی پابندی نہ کریں گے ان کو کالج سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔ میں کسی طرح جائز نہیں رکھتا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کردے۔

وقارالملک اپنے ماتحت ملازموں کا خاص خیال رکھتے تھے کوئی فوت ہوجاتا تو اس کے متعلق پوری معلومات بہم پہنچاتے۔ اس پر قرضہ ہوتا تو اُس کے ادا کرنے کا بندوبست کرتے۔ اس کے لڑکوں کے لئے وسائل معاش کا خاص خیال رکھتے۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کا انتظام کرتے بیواؤں کے لئے وظائف مقرر کرتے۔

جب وہ ورنگل کے صوبہ دار تھے، ایک موقع پر دورہ کرتے ہوئے ایک گاؤں سے گذرے جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔ انھوں نے گاؤں کے قریب پہنچتے ہی سواری روک لی اور اپنے تمام ساتھیوں کو اجازت دیدی کہ جس کا جی چاہے آگے چلا جائے خود ڈاکٹر کو لے کر صبح سات بجے گاؤں میں داخل ہوئے۔ تمام مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ ان کی تیمارداری اور علاج کا انتظام کرایا۔ ساڑھے تین بجے فارغ ہوکر جائے قیام پر پہنچے۔

ایک دورے میں ایک ہلکارجو ساتھ تھا کسی مقام پر بے پتا ہوگیا۔ وقارالملک نے منزل پر پہنچ کر پولیس اور سواروں کو چاروں طرف روانہ کردیا۔ شام کے چار بجے تک اس کا پتہ نہ مل سکا۔ وقارالملک نے اس وقت تک کھانا نہ کھایا۔

جب وہ حیدر آباد میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے تو عوام اور اکابر سے ملاقات کے لئے الگ الگ جگہیں مقرر کر رکھی تھیں جہاں عوام سے ملاقات کرتے تھے وہ جگہ کوٹھی کے صحن میں پھاٹک کے قریب تھی۔ ایک شامیانہ نصب کرا لیا تھا اور نشست گاہیں خاصی پر تکلف تھیں جہاں اکابر سے ملاقات کرتے تھے وہاں لکڑی کی معمولی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی عوام سے ملاقات کی جگہ پہنچ جاتے اور سب سے آزادانہ ملتے۔ ہر ایک کی بات توجہ سے سنتے۔ اس اثنا میں کوئی بڑا عہدہ دار آجاتا تو فرماتے کہ ملاقات کی جگہ چل بیٹھئے۔ عوام سے فارغ ہو کر بڑے لوگوں سے ملتے۔

وقار الملک کو اگرچہ بڑے بڑے عہدوں پر رہنے کا موقع ملا اور وہ خاصی بڑی تنخواہ پاتے تھے۔ لیکن ان کی آمدنی کا بڑا حصہ عزیزوں اور غریبوں کی امداد یا قومی کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ خود عموماً تنگ دست رہتے اور سادگی میں گزارہ کرتے۔

وہ وقتاً فوقتاً اعلیٰ حضرت نظام کی پیشی میں جایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر اعلیٰ حضرت نے ان کا چشمہ دیکھا تو فرمایا۔ مولوی صاحب! چشمے کا فریم تو بہت خراب ہے۔ وقار الملک نے عرض کیا۔

پیر و مرشد! اگر اتفاق سے یہ چشمہ کہیں رہ جائے تو لوگ لے لاکر دے دیں گے۔ کیونکہ اس کی قیمت صرف چھ آنے ہے اور یہ مشتاق حسین کی آنکھیں ہیں۔

اعلیٰ حضرت نے نہایت قیمتی اور اعلیٰ درجہ کا فریم بنوا کر وقار الملک کو مرحمت فرمایا۔ اسے انھوں نے کبھی استعمال نہیں کیا اور ایک عزیز یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھا۔

ان کی طبیعت میں انکساری بہت تھی۔ اس سلسلے میں صرف ایک واقعہ پیش کروں گا۔ حیدر آباد میں کسی مسجد کے ایک نابینا کا ان کے ہاں سے کھانا مقرر تھا۔ ایک مرتبہ شدت سے بارش ہوئی۔ ملازم رات کا کھانا نابینا کو نہ پہنچا سکا۔ وقار الملک کو بڑی دیر میں معلوم ہوا تو خود اٹھے اور پیدل کھانا نابینا کے پاس لے کر گئے۔ وہ بھوکا بیٹھا تھا بہت بڑبڑایا اور خفا ہوا کہ آدھی رات کو روٹی لیکر آیا ہے۔ جا ہم نہیں کھاتے۔ وقار الملک نے بڑی خوشامد اور منت سماجت سے اسے راضی کیا اور کھانا کھلا کر واپس آئے تاہم اس پر قطعی ظاہر نہ ہونے دیا کہ خود کھانا لے کر آئے تھے۔

دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر اشکبار ہو جاتے۔ ایک مرتبہ علالت کے باعث پہاڑ پر چلے گئے وہاں سنا کہ ان کی صوبہ داری میں بارش نہ ہونے کے باعث عوام کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور غریبوں کے مویشی مر رہے ہیں فوراً پہاڑ سے واپس آئے۔ جمعہ کی نماز کے بعد ایک چھپر کے نیچے بیٹھے ہوئے اطراف علاقہ کی رپورٹیں دیکھ رہے تھے جو دردناک اطلاعوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کاغذات اٹھاتے، پڑھتے اور روتے جاتے تھے دو گھنٹے میں خدا کی رحمت سے ابر آیا اس قدر پانی برسا کہ چھپر ٹپک پڑا اور وقار الملک بھیگ گئے۔ پھر اٹھے۔

یہ وقار الملک کے فضائل و مکارم کی صرف چند جھلکیاں ہیں جو سرسری طور پر پیش کر دی گئی ہیں انھیں سامنے رکھ کر غور فرمایئے کہ وہ کس درجہ نادر و یگانہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے انتظامی کارناموں پر بحث کرنے کیلئے ایک فرد دکار ہے بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دولت آصفیہ پچاس سال تک جس نظام حکومت پر چلتی رہی اسکی ترتیب اور اجزا میں سب سے بڑا حصہ وقار الملک ہی کا تھا۔ انھوں نے حکومت کو خودسری کی بلندیوں سے اتار کر حقوق جمہور کی نگہبانی و پاسداری کی راہ پر لگایا اور اپنے حسن عمل سے وہ نمونہ پیش کیا۔ جس کی مثالیں کسی بھی ملک میں بہت ہی کم ملیں گی۔ سرسید کے رفیقوں میں ایسے جامع اوصاف کا آدمی کوئی دوسرا نہ تھا۔

حقائق و عبر

۱۔ مذہبی جنون (FANATICISM)

مغربی پاکستان کی ایک مذہبی جماعت کے ترجمان میں حسب ذیل افسوسناک خبر شائع ہوئی ہے (ہم نے اس سلسلہ میں افراد متعلقہ اور مقامات۔ نیز مجلہ مذکور کے نام عمداً حذف کر دیئے ہیں)

> یہ تاسف انگیز اور وحشتناک خبر آپ کے علم و مطالعہ میں آ چکی ہو گی کہ ..... کے مشہور..... عالم اور وہاں کی ..... مسجد کے خطیب و امام مولانا ..... نے ..... (فلاں مقام پر) ایک تقریر کی۔ تقریر سے فارغ ہونے کے بعد وہ دعا کیلئے ہاتھ اٹھایا ہی چاہتے تھے کہ ..... کے ایک نوجوان ..... نے انہیں آناً فاناً زمین پر لٹا لیا اور استرے سے ان کی گردن کاٹ دینے کی کوشش کی۔ لیکن جو لوگ اس وقت مولانا کے گرد و پیش بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی بروقت ہمت اور مداخلت سے ..... اس فعل شنیع میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم ..... کی گردن، ناک، کان اور رخسار (؟) پر گہرے زخم آئے ..... ملزم نے اقبال جرم کرتے ہوئے اپنے بیان میں کہا ہے کہ "مجھے ..... سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے ..... نے پچھلے دنوں اپنی تقریروں کے دوران میں ایسے جملے کہے تھے جن کو میں برداشت نہ کر سکا اور مجھے طیش آگیا اور میں نے یہ اقدام کیا۔

اس تاسف انگیز حادثہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مجلہ مذکور نے کہا ہے کہ

> عقلمندی اور علمی وقار کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے اختلاف ہو اس سے فراخدلی اور کشادہ پیشانی سے پیش آیا جائے اور ..... کی عزت و احترام کے جائز حدود کو بہرحال ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ یہ اختلاف سب میں ہوتا ہے لیکن اس کے اظہار کے لئے سلیقہ شعاری اور خردمندی کی ضرورت ہے۔ تلوار سونت کر علمی تحقیقات کے میدان کبھی جیتے نہیں جا سکتے .....

ہم اس باب میں موقر معاصر سے حرفاً حرفاً متفق ہیں لیکن گذارش یہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ذرا نظر دوڑا کر دیکھئے تو سہی کہ ہمارے ہاں کوئی مذہبی فرقہ ایسا بھی ہے جو کسی عقیدے یا نظریہ میں اختلاف رکھنے والوں سے فراخدلی اور کشادہ پیشانی سے پیش آئے۔ اور مخالف

کی عزت و احترام کے جائز حدود کو ملحوظ خاطر رکھ کر سلیقہ شعاری اور خردمندی سے تحقیقِ حق کرے ؟ ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ سب سے پہلے اعلان کر دیا جاتا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور اس کے بعد ہر اس شخص یا جماعت کو جس سے ہمیں ذرا سا بھی اختلاف ہو، ملحد، بے دین، فتنہ انگیز، مرتد اور نہ جانے کیا کیا قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہر منبر اور ہر محراب سے یہ آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ ہر محفل اور ہر مجلس میں انہی "القابات" کو دہرایا جاتا ہے۔ اگر مخالفت کرنے والوں کے پاس کوئی اخبار یا رسالہ ہے تو اس میں بھی اسی سب و شتم کی بوچھاڑ جاری رہتی ہے۔ اور اس طرح مسلسل عوام کے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے۔ ہم اس پر خوش ہوتے ہیں اور اسے دین کی خدمت میں جہادِ عظیم قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان تمام تلاطم انگیزیوں کا رخ ہمارے فریق مخالف کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا فریق ہم پر غالب آجاتا ہے اور ان کی اشتعال انگیزیوں سے متاثر ہو کر کوئی شخص ہمارے کسی ہمنوا پر ہاتھ اٹھا دیتا ہے تو اس وقت ہمیں فراخدلی اور کشادہ پیشانی، وسعت قلبی اور رواداری کے تمام سبق یاد آجاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے یاد آنے کا وقت وہ تھا جب ہمارا ہم نوا ہمارے مخالف کو ہدفِ سب و شتم بنا رہا تھا۔

ویسے تو عوام ہر جگہ جاہل اور جذباتی ہوتے ہیں۔ لیکن ہماری قوم کے عوام اپنی شعلہ مزاجی میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر چھرا گھونپ دینا اور گولی مار دینا ان کا معمول بن چکا ہے۔ جب اس قسم کے عوام کے جذبات کو مذہب کے نام پر ابھارا جائے تو اس سے جس قسم کے خطرناک اور تباہ کن نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ ظاہر ہیں۔ ان کی شعلہ مزاجی انہیں فوراً چھرا گھونپنے اور فساد برپا کر دینے پر آمادہ کر دیتی ہے اور چونکہ وہ اسے دین کی خدمت سمجھتے ہیں اس لئے ان خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کو ثواب کا کام اور جہاد کا عمل قرار دے کر اس پر فخر کرتے ہیں۔

چونکہ ہمارے عوام اس قسم کے جذباتی واقع ہوئے ہیں اس لئے ہمارے واعظوں اور خطیبوں میں سے بھی وہی لوگ زیادہ مقبول (یا پاپولر) ہوتے ہیں جو اشتعال انگیز (جذباتی) تقریریں کرتے ہیں۔ اس سے یہ مرض اور بھی زیادہ پھیلتا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری مذہبی جماعتیں معاشرہ کے اس خطرناک رجحان کی روک تھام کے لئے اپنے آپ کو بطور نمونہ پیش کریں۔ خود بھی جذبات پرستی کی بجائے علم و بصیرت، اور وسعتِ قلب و نظر سے کام لیں اور اپنے ارادتمندوں کو بھی عقل و فہم سے کام لینے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی تلقین کرتے رہا کریں۔ اپنے مسلک کے خلاف ہر تصور کو فتنہ قرار دے کر اپنے مخالفین کو مرتد، بے دین، ملحد گردانتے چلے جانے کا نتیجہ چھروں اور گولیوں کے سوا اور کس شکل میں برآمد ہو سکتا ہے ؟

۲۔ جواب دیجئے !

جب دستورِ پاکستان کی تدوین میں دیر پر دیر ہوتی چلی جا رہی تھی تو ہمارے اربابِ حل و عقد اس تاخیر کا جواز یہ بتاتے تھے کہ ہم نے ایک ایسا اسلامی دستور مرتب کرنا ہے جس کی مثل و نظیر کہیں نہیں مل سکے گی اور جو ہمارے اس دعوے کی صداقت کا زندہ ثبوت ہوگا کہ اسلام نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ چنانچہ دنیا ہمارے اس آئین کے لئے ہمہ تن انتظار تھی کہ

دیکھیں اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا؟

خدا خدا کر کے وہ آئین مرتب ہوا لیکن دنیا ہنوز انتظار میں ہے کہ یہ آئین (نوع انسانی تو ایک طرف خود) اہل پاکستان کی مشکلات کا حل کس طرح پیش کرتا ہے! وہ دیکھ رہی ہے کہ تمام مشکلات کا حل تو کجا، پاکستان کو اپنی روٹی کا حل بھی نہیں مل رہا اور اس کے لئے وہ بدستور دوسروں کا محتاج ہے۔ چنانچہ اب دنیا نے کسی نہ کسی انداز سے پوچھنا شروع کر دیا ہے کہ اس اسلامی آئین کے وہ درخشندہ نتائج کہاں ہیں جن کے متعلق اس شد و مد سے دعاوی کئے جا رہے تھے؟ پچھلے دنوں امریکہ کی میکگل یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز) کے ایک لیسرچ اسکالر مسٹر ایڈمز[1] پاکستان آئے۔ انھوں نے ڈھاکہ کی روٹری کلب میں ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ

> ساری دنیا آپ کے اس تجربہ کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہے جس کی رو سے آپ نے ان اصولوں کو جن کی خاطر اپنے ملک کو تقسیم کرایا تھا، اور جو پاکستان کی بنیادی آئیڈیولوجی ہے، عملی تشکیل دینا ہے۔ جس طرح افراد کی حالت ہے ویسے ہی اقوام کی صورت میں بھی دنیا ہمیشہ یہ دیکھتی ہے کہ کوئی قوم کر کے کیا دکھاتی ہے!
>
> (ڈان مورخہ ۳ر جنوری ۱۹۵۷ء)

دنیا کے اس سوال کا جواب، سب سے پہلے مجلس آئین ساز کے ان اراکین کے ذمہ ہے جنھوں نے اس دستور کو مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد شریعت حقہ کے ان علمبرداروں کے ذمہ جنھوں نے تبریک و تہنیت کے شادیانوں میں اسے اسلامی آئین قرار دیا تھا اور اس کے بعد مملکت کے موجودہ ارباب بست و کشاد کے ذمہ جو اس دستور کی عملی تشکیل کے ذمہ دار ہیں۔

ہم شروع ہی سے ان حضرات سے کہہ رہے تھے کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ لیکن اسلام دنیا میں بدنام ہو جائے گا۔ آج تک ہم دنیا سے یہی کہتے رہے ہیں کہ اسلام اپنے نتائج اس لئے مرتب نہیں کر رہا کہ اس صفحۂ ارض پر کہیں بھی اسلامی نظام قائم نہیں اب ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم یہاں اسلامی نظام قائم کریں گے۔ اگر آپ نے ایسا نظام قائم کر دیا جو فی الحقیقت اسلامی نہیں لیکن جسے آپ نے اسلامی کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا، تو دنیا یہی سمجھے گی کہ صحیح اسلامی نظام یہی ہے اور جب وہ اپنے نتائج کچھ بھی مرتب نہیں کریگا تو دنیا لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچے گی کہ اسلام کا دعویٰ (کہ وہ نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے) بے بنیاد ہے۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا خطرہ تھا ارباب شریعت خوش ہو گئے کہ اب قانون سازی کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں آ جائیں گے۔ اُس وقت کے ارباب بست و کشاد خوش ہو گئے کہ ہم اسلامی آئین کے ہیرو بن گئے۔ مجلس آئین ساز کے اراکین خوش ہو گئے کہ جو گتھی ان کے پیشروؤں سے نو برس تک نہ سلجھی تھی، انھوں نے (تو) یوں سلجھا دی۔ یہ سب خوش ہو گئے۔ ان کی بلا سے کہ دنیا اسلام کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی۔

کیا ملک میں کوئی بھی ارباب دیدہ و نظر ایسے نہیں جو اسلام کو اس بدنامی سے بچانے کی سعی کریں؟ یہ مشکل کام نہیں اس آئین کو قرآن کے مطابق بنا دیجئے اور پھر دیکھئے کہ اسلام کا یہ دعویٰ کس طرح ایک حقیقت بنکر سامنے آ جاتا ہے کہ اس میں تمام نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل ہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں ۔۔۔ ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

---

[1] جہاں تک مسٹر ایڈمز کا تعلق ہے وہ محترم پرویز صاحب کے پاس آئے تھے۔ اور انھوں نے انھیں بتایا تھا کہ اسلامک آئیڈیولوجی کیا ہے اور اسلامی

بابُ المُراسلات

ایک مفید مشورہ

لاہور سے طلوع اسلام کے ایک قدیمی کرم فرمانے ایک تفصیلی گرامی نامہ لکھا ہے جس میں انھوں نے ایک ایسا مشورہ دیا ہے جو ہمارے نزدیک اس قابل ہے کہ قارئین، طلوع اسلام بالعموم اور بزم ہائے طلوع اسلام کے اراکین بالخصوص اس پر گہری توجہ دیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

میں آپ کی کسی بزم کا ممبر تو نہیں لیکن طلوع اسلام سے میری دلچسپی بہت پرانی بھی ہے اور گہری بھی۔ میں اس کا مطالعہ سنہ ۱۹۴۰ء سے کر رہا ہوں۔ طلوع اسلام کے علاوہ میں نے اس دور کی مختلف مذہبی اور سیاسی تحریکوں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور ان کے لٹریچر کو بھی کنگھالتا رہا ہوں۔ طلوع اسلام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے میرا ایک حقیر سا مشورہ ہے جسے اگر وہ درخور اعتنا سمجھیں تو میرا خیال ہے اس سے مفید نتائج مرتب ہوں گے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ طلوع اسلام کی فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات دوسرے لوگوں سے (بالخصوص جماعت اسلامی سے متعلق حضرات سے) بحث میں الجھتے ہیں۔ میرے نزدیک اس سے سوائے وقت اور توانائی ضائع کرنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔

دنیا میں مختلف لوگ، مختلف سطح کی فکر اور بصیرت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنی خیالات سے مطمئن ہوتا ہے جو اس کی فکری سطح سے نیچے یا زیادہ سے زیادہ اس کے برابر ہوں۔ وہ اس سے اونچی سطح کی باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں فطرت کی طرف سے اپنی فہم و بصیرت کے بڑھانے کا شوق ملتا ہے۔ یہ لوگ یقیناً اپنی سطح سے بلند سطح کی چیزوں کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن ان کا شمار مستثنیات میں ہوتا ہے۔ اکثریت انہی کی ہوتی ہے جو اپنی سطح سے اونچی بات کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اس کے سمجھنے کا شوق ان میں ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی مذہب کے متعلق جو کچھ پیش کرتی ہے وہ ایک خاص سطح کی ذہنیت والوں کو مطمئن کر دیتا ہے۔ یہ لوگ اس سطح سے بلند سطح کی چیزیں سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ جو کچھ اس جماعت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے وہ وہی ہے جو مذہب کا قدامت پرست طبقہ آج تک پیش کرتا چلا آ رہا ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ ان حضرات کی زبان ماڈرن ہوتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی جماعت میں بلند ترین ذہنیت اس جماعت کے سب سے اونچے فرد کی سمجھی جاتی ہے۔ جماعت کے باقی افراد اس کی سطح سے اونچے جا ہی نہیں سکتے۔ مثلاً جماعت احمدیہ میں بلند ترین ذہنیت میرزا صاحب (مرحوم) کی سمجھی جاتی ہے۔ اب کوئی مرزائی ان کی سطح سے اونچا جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا اگر کوئی ایسا شخص مرزائیوں کے ہاں پیدا ہو جائے

جس کی ذہنی صلاحیت مرزا صاحب سے اونچی ہو تو وہ مرزائی رہ نہیں سکتا۔ وہ زود یا بدیر مرزائیت چھوڑ دے گا۔ (بشرطیکہ دیگر موانع اس کی راہ میں حائل نہ ہوں) اسی طرح اسلامی جماعت میں سب سے بلند ذہنیت ان کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی سمجھی جاتی ہے۔ عام اراکین جماعت تو ایک طرف، ان کے نائب (امین احسن صاحب اصلاحی) نے انھیں مزاج شناس رسول بتایا تھا۔ ان کے ایک دوسرے رفیق (نعیم صدیقی صاحب) نے لکھا تھا کہ اگر ہمالیہ پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو برصغیر ہندوپاک میں ایک ہی شخصیت دکھائی دیگی یعنی ان کے امیر کی۔ حال ہی میں جب مودودی صاحب نے منصب امارت سے استعفیٰ دیا تو جماعت کے ترجمان (ایشیا) نے اسے (جماعت کے لئے ہی نہیں بلکہ) پاکستان کی زندگی میں اسلامی نقطہ نگاہ سے سب سے اہم واقعہ قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے متعلق ان کی عقیدت وارادت کا یہ عالم ہو جماعت کے افراد کی ذہنیت اس سے اونچی جا ہی نہیں سکتی۔ جس کی سطح ذہنی اس سے اونچی ہوگی وہ اس جماعت میں رہے گا ہی نہیں۔

اب رہا یہ کہ خود مودودی صاحب کی ذہنی سطح کیا ہے، سو اس کے لئے کسی گہری تحقیق کی ضرورت نہیں۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ جو اسے تسلیم کرتا ہو کہ اسلام مذہبی آزادی دیتا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان مذہب تبدیل کرے تو اس کی سزا قتل ہے جو صغرسنی کی شادی کو جائز قرار دیتا ہو۔ جو اسے صحیح مانتا ہو کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر چھ برس کی تھی۔ جو اسے باور کرلیتا ہو کہ نبی اکرم پر واقعی کسی نے جادو کر دیا تھا۔ جو بڑے فخر سے بیان کرتا ہو کہ جس براق پر نبی اکرمؐ معراج کی شب سوار تھے اسے دیکھ کر راستے کے اونٹ بدک گئے تھے اور رسول اللہ نے راستے میں کسی قبیلے کے مٹکے سے پانی پیا تھا۔[1] جو یہ مانتا ہو کہ احکام سبت کی خلاف ورزی کرنے والے سچ مچ بندر بن گئے تھے[2] جو یہ کہتا ہو کہ ہاروت اور ماروت واقعی دو فرشتے تھے جو اللہ کی طرف سے لوگوں کی آزمائش کے لئے بھیجے گئے تھے۔ جس طرح پولیس کے سپاہی نشان زدہ نوٹ دے کر بھیجے جاتے ہیں[3] حتیٰ کہ جو جہاز کے ایک تختے پر اضطراری حالت میں متعہ (وقتی جنسی تعلق) کو جائز سمجھتا ہو۔ جو شخص اس قسم کی باتوں کو صحیح مانتا اور دین کا جزو سمجھتا ہو۔ اس کی ذہنی سطح کے متعلق کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ اب آپ چنے

---

1 یہ تمام باتیں طلوع اسلام میں پہلے آچکی ہیں۔

2 مودودی صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔ "میرے نزدیک قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہٖ اسی حال پر رہنے دیئے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہو گئے ہوں گے"۔ (تفہیم القرآن صفحہ ۹۲)

3 ۔ مودودی صاحب کے الفاظ یہ ہیں " فرشتوں کے انسانی صورت میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنت الٰہی کے کارپرداز ہیں اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گردوپیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں (ہاروت ماروت) کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بری تھی۔ تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خور حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اسے عین حالت ارتکاب جرم میں پکڑیں اور اس کے لئے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔ (تفہیم القرآن صفحہ ۹۸)

کہ جس جماعت کے بلند ترین انسان کی ذہنی سطح ایسی ہو۔ اس جماعت کے عام افراد سے یہ توقع رکھنا کہ وہ دین کے اس تصور اور قرآن کے ان حقائق کو (APPRECIATE) کر سکیں گے جو طلوع اسلام کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں، خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں۔ میرا مقصد اس جماعت یا کسی اور کی تنقیص نہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس جماعت کا سب سے اونچی سطح کا انسان ان باتوں کو صحیح مانتا ہو جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اس جماعت کے افراد کی ذہنی سطح اتنی اونچی ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ اس سطح کے حقائق کو سمجھ سکیں جسے طلوع اسلام پیش کرتا ہے۔

ان حالات میں میرا خیال یہ ہے کہ طلوع اسلام سے دلچسپی رکھنے والے جو حضرات ان لوگوں سے بحث میں الجھتے ہیں۔ وہ ناحق اپنی محنت اور وقت ضائع کرتے ہیں میرا ان حضرات سے مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اپنے وقت کو کسی اور مفید کام میں صرف کیا کریں۔ وہ اپنا لٹریچر ان لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں جن کی ذہنی سطح اتنی بلند ہو کہ وہ قرآنی حقائق کو سمجھ سکیں۔ یا ان میں کم از کم کچھ سیکھنے کا جذبہ ہو۔ (اس کے بعد کچھ باتیں ادارہ سے متعلق ہیں جنھیں حذف کر دیا گیا ہے)

طلوع اسلام | جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے۔ ہمارے اس دیرینہ کرم فرما کا یہ مشورہ بڑا مفید ہے حقیقت یہ ہے کہ ہم شروع ہی سے اپنے ہم فکر احباب سے گذارش کرتے چلے آئے ہیں کہ وہ (جماعت اسلامی والوں سے ہی نہیں بلکہ) کسی سے بھی بحث مباحثہ میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ کچھ فائدہ نہیں ہوتا بلکہ الٹا نقصان ہوتا ہے۔ ان کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ جن لوگوں میں اس کی صلاحیت یا ذوق دیکھیں ان تک طلوع اسلام کا لٹریچر پہنچائیں۔ اس کے بعد اگر وہ کسی بات کی مزید وضاحت چاہیں، یا کسی قسم کا اعتراض کریں، تو اگر اس کا جواب کسی اور جگہ موجود ہو تو انھیں اس مقام کی نشاندہی کر دیں۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو ان سے کہہ دیں کہ وہ براہ راست ادارہ سے استفسار کریں۔ از خود کچھ نہ کہیں۔

امید ہے ہمارے ہم فکر احباب اس کا خاص خیال رکھیں گے۔

مزاج شناسِ رسولؐ

یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کون سی ہیں؟ اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسول ـــ مزاج شناس رسول کون ہیں۔ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔

صفحات قریباً چار سو ـــــــ قیمت:- چار روپے

مرکزی بزم طلوع اسلام

(رابطۂ باہمی)

طلوع اسلام کنونشن میں طے پایا تھا کہ مختلف مقامات کی بزموں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآنی فکر کی نشرواشاعت کے کام کو زیادہ سے زیادہ وسعت دیں۔ اپنے علاقہ کے مختلف افراد سے ذاتی طور پر ملاقاتیں۔ ادارہ کی طرف سے شائع شدہ پمفلٹوں کی عام تقسیم۔ مقامی لائبریریوں میں طلوع اسلام کے لٹریچر کو رکھنا۔ کالجوں کے طالب علموں میں اس لٹریچر کو پھیلانا۔ یہ اس کام کے مختلف اجزاء تھے۔ یہ بھی طے پایا تھا کہ ہر بزم اپنی اپنی کارگذاری کی رپورٹ ہر مہینہ باقاعدگی سے مرکزی بزم کو بھیجتی رہے تاکہ اس سے ایک طرف کام کی رفتار پر نگاہ رہے اور دوسری طرف مختلف بزموں کو ایک دوسرے کے طریق کار سے واقفیت رہے۔ معلوم نہیں مختلف بزموں نے اس ضمن میں کیا کیا ہے۔ لیکن ان کی طرف سے اس قسم کی رپورٹ کوئی موصول نہیں ہوئی۔ ان سے تاکید کی جاتی ہے کہ اپنی رپورٹیں مرکزی بزم کو باقاعدہ بھیجیں۔

(۲) مرکزی بزم نے فیصلہ کیا ہے کہ سردست حسب ذیل تین پمفلٹوں کا ترجمہ سندھی اور گجراتی زبانوں میں شائع کیا جائے۔

۱۔ روٹی کا مسئلہ ۲۔ تکذیب دین کون کرتا ہے؟ اور ۳۔ اطاعت رسول

جن بزموں کو یہ پمفلٹ مطلوب ہوں وہ مطلع فرمائیں کہ انہیں کتنی تعداد میں پمفلٹ درکار ہوں گے۔

۳۔ مرکزی بزم طلوع اسلام کا دفتر خلیق منزل ۱۲۵ گارڈن ویسٹ کراچی ۳ میں کھول دیا گیا ہے۔ مقامی بزمیں براہ کرم پتہ نوٹ کرلیں اور آئندہ خط وکتابت اسی پتہ پر کریں۔

۴۔ بزم طلوع اسلام لاہور نے اطلاع دی ہے کہ لاہور کے جملہ معاونین کا عام اجلاس ہر مہینہ بلایا جایا کرے گا جس کی اطلاع ایک ہفتہ قبل دی جایا کرے گی اور مجلس مشاورت کا اجلاس ہر سوموار کو بعد نماز مغرب بزم کے دفتر میں منعقد ہوا کرے گا دفتر کا ٹیلیفون نمبر ۶۰۰۲۶ ہے۔

بزم لاہور نے تین پمفلٹ شائع کئے ہیں۔ پیام اقبال۔ مقام اقبال اور قرآنک سوشل آرڈر جن میں سے ہر ایک کی قیمت ایک آنہ ہے۔ بزم طلوع اسلام دارالقرآن لسبت روڈ۔ لاہور سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

۵۔ یہ خبر شائع کی جا چکی ہے کہ سیالکوٹ میں خواتین کی بزم طلوع اسلام بھی قائم ہو چکی ہے۔ ترجمان کا پتہ یہ ہے بیگم ڈاکٹر شیخ ریاض احمد صاحب ۹۵ بازار روڈ۔ نزد سی۔ ایم۔ ایچ۔ سیالکوٹ چھاؤنی۔

مقامی ہم فکر خواتین ان سے رابطہ پیدا کریں۔

ترجمان مرکزی بزم طلوع اسلام
خلیق منزل ۱۲۵ گارڈن ویسٹ کراچی ۳

اسلام کی سرگزشت

یونانی اور رُومی اثرات

یونانی فلسفہ

گذشتہ اقساط میں ان اثرات کی نشاندہی کی جاچکی ہے جو دیگر ادیان و ملل خصوصاً ایرانی مذہب ۔ زرتشتیت مانویت اور مزدکیت نے اسلام پر چھوڑے تھے۔ مضمون کی پچھلی قسط میں ان اثرات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو ایرانی لٹریچر کے علاوہ یونانی و رومی علوم نے اسلام پر مرتب کئے تھے۔ یہ بیان ہنوز جاری ہے۔

بہرحال یونان کے علوم عربی کے ذریعہ جو کچھ ہم تک پہنچے ہیں وہ سریانی کتابوں ہی سے عربی میں منتقل ہو کر آئے ہیں۔ ابتداءً مسلمان یا عرب مصنفین کا ماخذ یہ سریانی کتابیں تھیں۔ یہ سریانی لوگ یونانی علوم کو نہایت دقیقہ رسی اور دیانت وامانت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کرتے تھے بشرطیکہ اس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے منطق، طبیعیات، طب، ریاضت، رہگئیں الہیات وغیرہ تو وہ اس میں اعتدال سا پیدا کر کے اسے مسیحیت کے مطابق بنا لیتے تھے۔ حتیٰ کہ انھوں نے افلاطون جیسے شخص کو اپنی کتابوں میں ایک مشرقی راہب بنا ڈالا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ اس نے لوگوں کی آبادی سے دور جنگل میں اپنے لئے ایک عبادت گاہ بنا لی تھی جس میں وہ سالہا سال تک عبادت کرتا رہا۔ بعینہٖ اسی طریقے پر ان کے بعد مسلمان چلے انھوں نے بھی الہیات کا وہ بڑا حصہ چھوڑ دیا جو انھیں اسلامی تعلیمات کے خلاف نظر آیا۔ سریانیوں نے محض یونانی زبان سے ہی ترجمہ کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پہلوی زبان سے بھی تراجم کئے چنانچہ پہلوی زبان سے انھوں نے تاریخ اسکندر کا ترجمہ کیا جسے ایرانیوں نے یونانی زبان سے منتقل کیا تھا پھر سریانیوں نے اسے پہلوی زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔ ایسے ہی انھوں نے کتاب کلیلہ ودمنہ کا چھٹی صدی مسیحی میں سریانی میں ترجمہ کیا اور آٹھویں صدی مسیحی میں قصہ سندباد کو سریانی زبان میں منتقل کیا۔

سریانیوں میں سے دین داد کے مشہور ترین لوگوں میں سے جسے مسلمان بھی پہچانتے ہیں بار دیصان یا ابن دیصان (BARDAISAN) تھا (اس کا ۲۲۲ء میں انتقال ہوا تھا) دیصان ایک نہر کا نام ہے جس کی طرف وہ منسوب ہے۔ یہ ایک دینی

مسلک کا بانی تھا جس میں اس نے بُت پرستی کو نصرانیت کے ساتھ آمیز کیا تھا جیسا کہ اس سے پہلے مانی کر چکا تھا۔ یہ احیام کی بعثت کا منکر تھا اور کہا کرتا تھا کہ مسیح کا جسد حقیقی جسم نہیں تھا بلکہ محض ایک صورت تھی جسے خدا نے لوگوں کے لئے احیام کے مشابہ بنا کر بھیج دیا تھا۔ اس کی اور بھی بہت سی تعلیمات تھیں جو اسلام کے ظہور کے بعد بھی باقی رہیں یہی وہ آثار تھیں جن سے رافضیوں نے اپنے بعض اقوال میں مدد لی ہے۔ بعض لوگ خود کو ابن دیصان کی طرف منسوب بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ابوشاکر دیصانی ایک مشہور شخصیت ہیں۔ علمائے کلام نے ان کی تردید میں شروع کیں چنانچہ وہ ان کے متبعین کے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں دیصانیہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

ان کے مشہور ترین افراد میں سے جیس رسعنی بھی تھے جو راس عین کے رہنے والے تھے ان کا انتقال ۵۳۶ء میں ہوا۔ ان لوگوں میں بہت زیادہ مشہور رہیں جنھوں نے یونانی علوم و آداب میں کمال حاصل کیا تھا۔ انھوں نے بہت سی یونانی کتابوں کا سریانی زبان میں ترجمہ کیا جن میں سے بعض کتابیں برطانوی لائبریری میں آج تک محفوظ ہیں۔ ان میں سے کچھ رسالے ارسطو کے ہیں باقی فورفوریوس اور جالینوس کے ہیں۔ انھوں نے منطق میں ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا جو مکمل نہیں ہے۔ اس رسالہ میں انھوں نے مقولات عشرہ ایجاب وسلب اور جنس وفصل وغیرہ سے بحث کی ہے۔ نیز ایک اور رسالہ چاند کے اثرات اور آفتاب کی حرکت پر بھی تصنیف کیا تھا ان کی کتابیں یعاقبہ اور نساطرہ فرقوں میں خوب پھیلی ہوئی تھیں اور وہ منطق اور طب میں ان کتابوں کو بڑا قابل اعتماد سمجھتے تھے۔

سرجیس کے علاوہ ...... اسی زمانے میں ...... اور بھی بہت سے لوگوں نے نفس انسانی، قضاء و قدر اور گرمی سے متعلق اور اس موضوع پر کہ "خود انسان ایک چھوٹی سی دنیا ہے۔" اور نیز یہ کہ "انسان جسم اور روح سے مرکب ہے" بہت سی کتابیں لکھی تھیں ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے جب ان ممالک کو فتح کیا تو بعض سریانی تو مسلمان ہو گئے مگر بعض اپنے قدیم آبائی دین پر قائم رہتے ہوئے جزیہ ادا کرتے رہے۔ لیکن اس کے بعد سے سریانی علوم و آداب کا فی الجملہ انحطاط اور زوال شروع ہو گیا تھا، تاہم کچھ لوگ ان میں پھر بھی ایسے پیدا ہو جاتے تھے جو اموی اور عباسی عہد میں علم و فضل کے بلند مقام پر فائز تھے۔ ان کے سریانی مدارس دولت امویہ کے دور میں بھی اسی طرح کھلے رہے جیسا کہ وہ اسلام سے پہلے کھلے ہوئے تھے۔ خلفاء اور امراء ان کے اندرونی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کرتے تھے بجز اس صورت کے کہ خود ان کے درمیان میں کوئی جھگڑا ہو جائے اور ان کا کوئی فریق کسی والی یا گورنر کے پاس پناہ لے اور اس سے مدد کا خواہاں ہو۔

اموی دور حکومت میں ان میں سے یعقوب رُہاوی (تقریباً ۶۴۰ء تا ۷۰۸ء) زیادہ مشہور گذرے ہیں۔ انھوں نے الٰہیات کی بہت سی یونانی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ یعقوب رُہاوی کی شخصیت نے بڑے ہی دور رس اثرات مرتب کئے۔ ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے نصاریٰ کے مذہبی پیشواؤں کو یہ فتوے دیا تھا کہ ان کے لئے مسلمانوں کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینا جائز ہے۔ بلا شبہ اس فتوے سے جہاں یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ میں بعض مسلمان ان لوگوں سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے اور اس طرف ان کو رغبت ہو گئی تھی وہیں ساتھ ہی اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ نصاریٰ کو ابتداً اس میں تامل ہوتا تھا کہ وہ

مسلمان بچوں کو فلسفہ کی تعلیم دیں یا نہ دیں۔

جب عباسی عہد میں فلسفہ اور دیگر علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا دور آیا۔ تو ان سریانی علماء نے ترجمہ کے کام میں بھی بڑا کافی حصہ لیا۔ مثلاً حنین ابن اسحٰق۔ ان کا بیٹا اسحٰق۔ ان کا بھانجا حبیش۔ ان لوگوں میں سے ہیں جن کا مستقل تذکرہ ہم آئندہ کسی مقام پر کریں گے۔

تصریحات بالا سے یہ امور واضح ہو جاتے ہیں کہ یونانی ثقافت عراق، شام اور اسکندریہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور یونانی علوم کی ترویج ان مدارس کے ذریعے ہو رہی تھی جنھیں سریانیوں نے جاری کر رکھا تھا۔ یہ مدارس اور یہ تعلیمات اسلامی حکومت کے ماتحت بھی سرگرم عمل تھیں۔ یہ محکوم قومیں اپنے حاکموں کے ساتھ اس طرح پر خلط ملط تھیں جس کی تفصیل ہم پہلے دے چکے ہیں۔ اس کے نتائج میں سے یہ بات تھی کہ یہ تعلیمات مملکت اسلامیہ میں روشن سے روشن تر ہوتی چلی گئیں۔ مختلف عقلوں کا ٹکراؤ ہوا جیسا کہ مختلف اجناس کا ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ اس ٹکراؤ سے وہ عربی اور اسلامی ثقافت پیدا ہوئی جو آج ہمارے لئے وجہ صد افتخار ہے اور اسی سے دینی فرقے اور اسلامی فلسفہ اور دیگر علمی فنی اور ادبی حرکات شروع ہوئیں۔

عرب قدیم زمانے سے خود ان تہذیبوں سے لگاؤ رکھتے چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ قفطی نے اپنی کتاب "اخبار الحکماء" میں بیان کیا ہے کہ حارث بن کلدہ جو قبیلہ بنو ثقیف سے تھا اور طائف کا رہنے والا تھا سرزمین ایران گیا اور ایران کے شہروں میں رہ کر اس نے علم طب حاصل کیا۔ خصوصیت کے ساتھ جندیشاپور میں اس نے طب پڑھی۔ یہ واقعہ اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت کا ہے۔ فن طب میں وہ بڑا ماہر ہو گیا تھا اور عرصہ تک ایران میں مطب اور علاج کرتا رہا۔ اہل ایران میں سے جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے انھوں نے اس کی مہارت فن کی شہادت دی تھی۔ اس کی طبی مہارت عربوں میں کافی مشہور ہو چکی تھی۔ بیمار لوگوں کو رسول اللہ صلعم بھی اس کے پاس بھیج دیا کرتے تھے کہ اس کے پاس جا کر اپنے مرض کے متعلق دریافت کریں اور اس کا علاج کریں۔ سمیہ جو ابن زیاد ابن ابیہ کی ماں تھی وہ اسی حارث بن کلدہ کی باندی تھی۔

ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب "طبقات الاطباء" میں لکھا ہے کہ نضر بن حارث بن کلدہ جو نبی صلعم کا خالہ زاد بھائی ہوتا تھا اس نے بھی اپنے باپ کی طرح مختلف ممالک کا سفر کیا تھا اور مکہ وغیرہ میں علماء و فضلاء کی صحبتوں میں رہا تھا۔ نیز احبار اور کاہنوں کے ساتھ بھی رہا تھا اور پرانے علوم میں سے اس نے بڑے جلیل القدر علوم حاصل کئے تھے۔ ساتھ ہی علوم فلسفہ اور اجزاء حکمت پر بھی دستگاہ رکھتا تھا اور اپنے باپ سے علم طب وغیرہ بھی حاصل کر چکا تھا۔ یہ نضر بن حارث نبی صلعم کی عداوت اور دشمنی میں ابوسفیان کا دست راست تھا۔ اور نضر کا خیال تھا کہ وہ اپنے فضائل اور معلومات سے نبوت کا مقابلہ کر سکے گا۔ لیکن کہاں ثریا اور کہاں تحت الثریٰ۔

اسلام کے بعد بھی یونانی علوم و فنون سے عربوں کا یہ لگاؤ برابر باقی رہا۔ چنانچہ مورخین کا بیان ہے کہ خالد بن یزید بن معاویہ علوم و فنون میں قریش کے سب سے بڑے عالم تھے۔ فن کیمیا اور طب میں انھیں کمال حاصل تھا۔ انھیں کیمیا اور طب میں بڑی بصیرت

حاصل ہو گئی تھی۔ ان کے رسائل کو دیکھنے سے ان کی معرفت اور مہارت کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس فن کو ایک راہب مریانس رومی سے سیکھا تھا۔ ان کے تین رسائل ہیں پہلے رسالہ میں تو انھوں نے ان واقعات کو بیان کیا ہے جو مریانس مذکور کے ساتھ انھیں پیش آئے۔ اور یہ بتایا ہے کہ انھوں نے یہ فن اس سے کس طرح سیکھا نیز وہ اور بیان کئے ہیں جن کی طرف مریانس نے اشارہ کیا تھا[1]۔ ابن الندیم نے بیان کیا ہے کہ فن کیمیا سے متعلق متقدمین کی کتابوں کو مہیا کرنے کی انھوں نے بڑی کوشش کی ہے۔ یہ خود بھی بڑے اچھے خطیب، شاعر، فصیح اور نہایت ہوشیار آدمی تھے۔ یہ وہ پہلے شخص ہیں جن کے لئے طب، نجوم اور کیمیا کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ ان کی تصنیف کردہ کتابوں میں سے کتاب الحرارات، کتاب الصحیفۃ الکبیر اور کتاب الصحیفۃ الصغیر اور فن کیمیا کے بارے میں ایک کتاب جو انھوں نے اپنے بیٹے کے لئے بطور وصیت کے لکھی تھی میں نے خود پڑھی ہیں[2]۔ خالد کا انتقال سنہ ۸۵ھ یا سنہ ۷۰۴ء میں ہوا تھا۔

ان تمام باتوں سے ہمیں نظر آتا ہے کہ یونانی ثقافت ــــ ایرانی تہذیب کی طرح ــــ مختلف شہروں کے اندر مسلمانوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کا حاصل کرنا ان کے لئے کچھ دشوار نہیں تھا اور انھوں نے ان لوگوں سے اس کا استفادہ اور تحصیل شروع کر دی تھی جو ان علوم پر دستگاہ رکھتے تھے ــــ اگرچہ یہ لوگ ان کے دین پر نہیں تھے ــــ جیسا کہ یعقوب رُہادی کے فتوے سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔

اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجیے کہ اسی عہد میں مسلمانوں اور نصرانیوں کے درمیان مذہبی ٹکراؤ بھی پیدا ہو چکا تھا وہ آپس میں عقائد پر گفتگو کرتے اور بحث مباحثے بھی کرتے تھے اس کا پتہ ہمیں اس سے لگ سکتا ہے کہ ــــ اسی عہد کے ــــ ایک مصنف نے جس کا نام یحییٰ دمشقی ہے اس طرز پر ایک پورا رسالہ تصنیف کیا تھا کہ "جب کوئی عربی تم سے یہ بات کہے تو تم اس کا یوں یوں جواب دو۔"

لہٰذا یہ نظریہ جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے کہ عرب اور مسلمان سب کے سب اپنے آس پاس کی تہذیبوں اور مذاہب و ادیان سے بالکل الگ تھلگ اور عہد عباسی تک ان سے بالکل بے بہرہ تھے بداہتہً غلط ہے اور یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ ان کی آراء اور ان کے علوم و فنون جو علمی دنیا کا آج بھی سرمایۂ افتخار ہیں خالص عربی عقول سے پیدا ہوئے تھے اور انھیں غیر عربی ماحول سے کوئی غذا نہیں ملی تھی۔ کیونکہ ہم گذشتہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں کہ عرب کے لوگ ــــ اور تو اور خود جاہلیت کے زمانہ میں بھی ــــ دیگر اقوام سے ایسے الگ تھلگ نہیں تھے اور اسلام کے بعد تو ان کو دیگر اقوام سے بہت ہی قریبی لگاؤ ہو گیا تھا۔ اور یہ امر کسی قوم کے لئے باعث طعن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ علم ایک مشترکہ ملکیت ہے اور ایک ایسا گھاٹ ہے جس کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ اس سے سیراب ہونے کا حق ہر انسان کو ہر وقت حاصل ہے۔ اس کے لئے کوئی حدود فاصل نہیں ہیں۔ جیسا کہ حکومتی سیاست دیگر

[1] ابن خلکان صفحہ ۲۱۱ ج ۱۔ [2] فہرست ابن الندیم صفحہ ۳۵۲

معاملات میں حدود عائد کردیتی ہے۔ بلکہ درحقیقت باعثِ طعن تو یہ چیز ہے کہ کوئی قوم اپنی آنکھیں بند کرلے، کانوں میں ڈاٹ لگالے اور ان نظریات وافکار سے کوئی سروکار نہ رکھے جو اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے ہوں یا یہ کہ اندھا تعصب اسے اس امر پر برانگیختہ کردے کہ وہ اپنی طرف ان چیزوں کو منسوب کرنے لگے جو اس کی نہیں ہیں اور جو چیزیں اس نے نہیں بنائیں ان کے متعلق دعوے کرنے لگے کہ وہ میں نے ایجاد یا اختراع کی ہیں۔

فصل سوم

یونانی اور رومی لٹریچر

یونان کا لٹریچر مواد کے اعتبار سے کافی سرمایہ دار اور موضوع کے اعتبار سے مختلف انواع واقسام پر مشتمل تھا۔ اس میں پرانے دیوتاؤں سے متعلق خرافاتی کہانیاں بھی تھیں، اور ڈرامائی اور افسانوی اشعار بھی۔ جو ان کی جنگوں اور بہادروں کے حالات پر مشتمل تھے۔ ان جنگی اشعار کو وہ (EPIC) کہتے تھے۔ الیاڈ اور اوڈیسہ نظمیں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس کے علاوہ غنائی اشعار (LYRIC) بھی ہوتے تھے۔ جن میں وہ اپنے احساسات کو پیش کرتے تھے۔ مدح، فخر، شجاعت و مردانگی، غزل، مرثیہ وغیرہ ساری چیزیں عربی اشعار کی طرح ان اشعار میں بھی بیان ہوتی تھیں۔

تمثیلی اشعار (DRAMATIC) میں وہ کسی جنگی واقعہ کو تخیل اور ساتھ ہی ایسے خیالی آدمیوں کا تصور پیش کرتے تھے جو ان جنگوں میں حصہ لیتے تھے۔ پھر واقعات وحوادث کی تصویرکشی کرتے تھے اور جنگی جوانوں کی زبان سے وہ باتیں کہلواتے تھے جو ان کی شخصیت سے مناسبت رکھتی ہوں۔

ان تمام انواع سے متعلق یونانیوں کے ہاں کافی لٹریچر موجود تھا جس نے قدیم اور جدید دونوں قسم کے عربی لٹریچر کو متاثر کیا۔ یونان اور یونانی نوآبادیوں میں ان کے کئی شاعر پیدا ہوئے جو شہرت کے اعتبار سے بلند مرتبوں پر فائز ہیں۔ ان کے اشعار آج تک بھی موجود ہیں جن کی مدد سے ان تمام امور کی تصویرکشی بسہولت کی جاسکتی ہے۔

شعر کے علاوہ ان کے ہاں ویسے بھی کافی ترقی یافتہ شکل میں کتابیں لکھنے اور لکچر دینے کا رواج تھا۔ کتابت اور خطابت اور علم بیان کے بارے میں انھوں نے مکمل اور منظم بحث کی ہے۔ مثال کے طور پر ابحاث ارسطو ہی کو اٹھا کر دیکھئے۔ پھر اس کے ساتھ ہی ہیروڈ ٹیٹس اور توسیدیڈ جیسے مورخ بھی ان کے ہاں موجود تھے۔ جنھوں نے ایسے منظم طریقہ پر تاریخ لکھی جس سے بہتر اس عہد میں ناممکن تھی۔

جب ان کی سلطنت جاتی رہی اور ان کا ملک رومی سلطنت کا ایک صوبہ قرار پاگیا تو ان کے علوم پر بھی ضعف واضمحلال طاری ہوگیا۔ البتہ جن اہم حقائق تک ان کے علماء نے رسائی حاصل کرلی تھی وہ ضائع نہیں ہوئے بلکہ برابر محفوظ رہے۔ اور اسی طرح ـــ جیسا کہ ایرانیوں اور عربوں کے درمیان بعد میں پیش آیا ـــ ان کے علوم سے رومیوں نے اپنی غذا حاصل کی۔ اس عہد میں بھی

پلوتارک اور تو سیدید جیسے کئی ادیب اور مؤرخ پیدا ہوئے

رہ گیا یہ سوال کہ کیا عربوں اور مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کی طرح ان کے لٹریری ذخیروں سے بھی اسی عہد ــــ یعنی بنوامیہ کے عہد حکومت ــــ میں متاثر ہونا شروع کر دیا تھا؟ تو بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ لٹریری تاثیر بہت ضعیف اور کمزور تھی۔ اموی عہد حکومت میں جو عربی اشعار ہمیں ملتے ہیں وہ اپنی ہیئت و ترتیب میں جاہلی اشعار کا ہوبہو نقشہ نظر آتے ہیں، چنانچہ بحر اور قوافی میں وہ انہی قواعد و ضوابط کی پیروی کرتے ہیں جو جاہلی شعراء نے ان کے لئے مقرر کر دیئے تھے۔ حتیٰ کہ اشعار کا موضوع بھی بالکل اسی نمونے کے ہوتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے ہاں صرف جنگی یا تمثیلی اشعار ہوا کرتے تھے۔ اموی عہد حکومت بلکہ عباسی دور میں بھی اس پر کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکا۔

عربی اشعار میں کسی یونانی مضمون کا دستیاب ہونا نہایت دشوار ہے۔ اگر ہم بنوامیہ کے عہد حکومت میں کوئی ایسا شاعر تلاش کرنے لگیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے یونانی یا رومی ہو اور اس نے عربی زبان سیکھ کر اس میں شعر گوئی کی ہو تو ہمیں ایک کوئی شاعر نہیں ملے گا۔ جبکہ اس کے برعکس ایسے شاعر بے شمار مل جاتے ہیں ــــ اس کا بیان پہلے بھی گذر چکا ہے ــــ جو اپنی اصل کے اعتبار سے ایرانی ہیں۔ اور اس کے بعد وہ عربی شاعر بن گئے۔ اس عہد میں ہم مسلمان مؤرخوں کو بھی دیکھتے ہیں کہ وہ بھی واقعات کی تدوین کے طریقہ میں یونانی طرز تدوین سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ ایرانی طرز تدوین سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ عربوں میں یونانیوں کی تاثیر کا ضعف اس سے اور بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کو یونانیوں کی لٹریری زندگی کے متعلق بہت ہی کم معلومات حاصل تھیں حتیٰ کہ عباسی دور حکومت میں بھی ان معلومات پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ ان کے خیال میں یونان کی تاریخ اسکندر اعظم یا اس سے پہلے سے شروع ہوتی ہے ــــ اور وہ بھی زیادہ تر خرافاتی افسانوں اور کہانیوں سے بھرپور ہے ــــ ان لوگوں نے تو سیدید جیسے مؤرخوں کے متعلق بہت کم سن رکھا تھا۔ انھوں نے ہومیروس کے متعلق البتہ کچھ تھوڑا بہت سن رکھا تھا۔ چنانچہ اس کے تھوڑے سے اقوال اور حوالے جو ناتمام اور مضطرب صورت میں ہیں شہرستانی نے اپنی تاریخ میں اور بہاؤالدین عاملی نے اپنی کشکول میں بطور استشہاد کے پیش کئے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ عربی لٹریچر بہ نسبت یونانی لٹریچر کے ایرانی لٹریچر سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ اس کی وجہ ــــ جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے ــــ یہ تھی کہ عرب (اور وہی حاکم عنصر تھے) اپنے اشعار کے بارے میں شدید طور پر متعصب ہوتے تھے۔ وہ کسی جدت یا بنیادی تبدیلی کو قطعاً گوارہ نہیں کرتے تھے۔ شعر کی نظم اور بحر اور قصیدہ کا قافیہ وغیرہ ایسی مقدس چیزیں تھیں جنھیں برائی کے ساتھ چھوا بھی نہیں جا سکتا تھا بلکہ ان موضوعات کا بھی یہی حال تھا جن میں اشعار کہے جاتے تھے۔ قافیہ کو اس کی بوجھل قیود سے آزاد کر دینا، ان بحروں کے علاوہ جن میں جاہلی شعراء اشعار کہہ گئے ہیں کسی نئی بحر کا اضافہ کرنا خواہ نئی بحروں کی موسیقی کتنی ہی طربناک کیوں نہ ہو۔ اور مضامین و معانی کے لئے جدید موضوع مہیا کرنا عربوں کے ہاں پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان تمام باتوں سے ان کی نگاہ میں ادب کی توہین اور ہتک ہوتی تھی۔ بلکہ وہ تو ان سے چھوٹی چھوٹی باتوں تک

میں جاہلی شعراء کی پیروی کو فخر جانتے تھے۔ غالباً اس کی بہترین مثال، ابن قتیبہ کی طبقات الشعراء کا یہ بیان ہے کہ متاخرین شعراء کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ان اقسام میں متقدمین کے طریقہ سے ذرا بھی ہٹ جائیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ وہ کسی آباد مکان پر کھڑا ہوتا ہے یا کسی پختہ اور شاندار عمارت پر روتا ہے جائز نہیں ہوگا کیونکہ متقدمین تو ویران اور غیر آباد مکانوں پر کھڑے ہوتے اور مٹے ہوئے نشانات پر رویا کرتے تھے۔ یا یہ کہنا کہ وہ گدھے یا خچر پر سفر کرتا ہے اور ان دونوں کی تعریف کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ متقدمین تو اونٹنیوں اور اونٹوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ یا شاعر کا یہ کہنا کہ وہ شیریں بہتے پانی پر کھڑا ہوا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ متقدمین ٹھہرے ہوئے اور گندے پانیوں پر کھڑے ہوا کرتے تھے۔ یا ممدوح کی طرف نرگس، آس اور گلاب کی کھیتوں کی نسبت کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ متقدمین تو عموماً شیح، حنوہ (عرب کے پھولوں کے نام) کے کھیتوں سے نسبت دیتے آئے ہیں۔ خلف الاحمر کا بیان ہے کہ مجھ سے کوفہ کے ایک بوڑھے آدمی نے کہا کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ شاعر اگر یہ کہتا ہے کہ زمین پر قیصوم اور جنجاث اگ آئے تو اسے برداشت کرلیا جاتا ہے (کیونکہ قیصوم اور جنجاث عرب کے درخت ہیں) اور میں اگر کہتا ہوں کہ زمین پر اجاص اور سیب کے درخت اُگ آئے ہیں تو اسے برداشت نہیں کیا جاتا۔ علاوہ ازیں شعراء کو اس کی اجازت بھی نہیں تھی کہ وہ عربوں کے اشتقاقات پر قیاس کرکے نئے الفاظ بنا کر اشعار میں استعمال کریں جو جاہلی شعراء نے استعمال نہیں کئے۔ خلیل بن احمد کہتے ہیں کہ مجھے کسی شاعر نے اپنا یہ مصرعہ سنایا۔ تَرَافَعَ الْعِزُّ بِنَا فَارْفَنْعَعَا (عزت نے ہم سے بلندی حاصل کی اور وہ بلند ہوگئی) میں نے کہا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ (فَارْفَنْعَعَا کوئی لفظ ہی نہیں ہے) وہ شاعر کہنے لگا کہ عجاج کے لئے اگر یوں کہنا تَقَاعَسَ الْعِزُّ بِنَا فَاقْعَنْسَسَا (عزت ہم سے پیچھے رہ گئی تو وہ پیچھے ہی رہ گئی) جائز ہے تو میرے لئے (فَارْفَنْعَعَا کہنا) کیوں جائز نہیں ہے۔[1]

اس سے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اسلاف کی تقلید کی حفاظت میں عرب کس حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ وہ اونٹنی اور اونٹ کی تعریفیں کرنے پر مجبور تھے۔ حالانکہ اب وہ گدھوں اور خچروں پر سواری کرتے تھے وہ یہ دعوے کرتے تھے کہ زمین میں قیصوم اور جنجاث اگ آئے ہیں۔ حالانکہ اب زمین میں اجاص اور سیب اگتے تھے۔ وہ اسے بھی جائز نہیں سمجھتے تھے کہ کسی مشابہ کلمہ پر قیاس کرکے ایک نیا لفظ مشتق کرلیں۔ ان جیسے لوگوں کے ہاں یہ آزادی کہاں ہو سکتی تھی کہ وہ ایسی جنگوں کے حالات اپنے اشعار میں بیان کریں جن کے نام بھی ان کے باپ دادوں نے نہ سنے ہوں۔ یا ایسے تمثیلی اشعار لکھیں جن سے ان کا ذوق ابا کرتا ہو۔ بلاشبہ ایرانیوں نے اپنے مضامین اور خیالات کے اعتبار سے عربوں پر ضرور اثر ڈالا مگر اس کی وجہ یہ تھی کہ ایرانی خود عربیت کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔ عربیت ان کی طرف منتقل نہیں ہوئی تھی۔ یونانی اور رومی لوگ چونکہ عربیت کی طرف منتقل نہیں ہوئے (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) لہٰذا ان کے اثرات بھی کچھ نمایاں نظر نہیں آتے۔

یونانیوں کی بہ نسبت ایرانیوں سے زیادہ متاثر ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ایرانی حکومت، عربی مملکت میں گھل مل گئی تھی

---

[1] ابن قتیبہ ص ۱۶۔ طبع یوروپ

ایرانیوں کی حیاتِ اجتماعیہ عربوں کی نگاہوں میں تھی جس کے متعلق وہ بہت کچھ جانتے تھے۔ لہٰذا انھیں ایرانی لٹریچر چکھنے کا زیادہ موقعہ تھا۔ لیکن اس کے برعکس یونانی زندگی عربوں کی معیشت سے بہت زیادہ دور تھی۔ نہ ہی وہ ان کی نگاہوں میں تھی کہ وہ اسے دیکھ سکیں۔ ان کے ہاں ایسے ایسے دیوتا تھے جو ان کی دینی تعلیمات کے سراسر برخلاف تھے۔ ان کا نظم سیاسی اور نظم اجتماعی ایسا تھا جس سے عربوں کو کبھی سابقہ ہی نہ پڑا تھا۔ قسم قسم کے کھیل تھے جن سے عرب کے لوگ قطعاً ناواقف تھے۔ لٹریچر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اجتماعی معیشت کی ایک منعکس صورت ہی ہوتی ہے۔ ان باتوں کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ عرب کے لوگ یونانی لٹریچر سے غیر متاثر رہتے چنانچہ وہ غیر متاثر رہے۔

اس کے باوجود —— ہمیں یہ چیز نہیں بھولنی چاہیئے —— کہ یونان کی تین چیزیں ایسی ضرور تھیں جن کا عربی لٹریچر میں نمایاں اثر نظر آتا ہے۔

(اول) کچھ الفاظ جو عربوں نے یونانی زبان سے لئے ہیں۔ جیسے قِسْطَاسٌ (ترازو) مَنجَنِیق (آئینہ) بِطَاقَۃٌ (کاغذ رقعہ) قَسْطَلٌ (غبار) قِنْطَارٌ (ڈھیر) بِطْرِیقٌ (بڑا پادری) تِرْیَاقٌ (زہرمار) نُقْرِسٌ۔ قُولَنْجٌ (دو بیماریوں کے نام) ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے قاضی شریح سے ایک سوال پوچھا۔ قاضی صاحب نے اس کا جواب دیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا قَالُونُ جس کے معنی رومی زبان میں یہ ہیں کہ تم نے صحیح جواب دیا[1]۔ غرضیکہ عربی زبان میں اس قسم کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔

(دوم) وہ اثرات جو نصرانی شعراء کے اشعار میں زمانۂ اسلام میں بھی نظر آتے ہیں (اخطل اور قطامی کا نام بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے) لیکن واضح رہے کہ ان کے اشعار میں نصرانیت کے اثرات بہت ہی کم ہیں۔ چنانچہ "پادری لامنس" خود کہتے ہیں کہ دیوانِ اخطل میں نصرانیت کے اثرات بہت ہی کمزور ہیں۔ بلکہ اخطل کی نصرانیت بھی کچھ سطحی ہے۔ جیسا کہ بدوی لوگوں میں تمام دینی عقائد کا حال ہوتا ہے۔

(سوم) یونانی امثال و حِکَم۔ عربی لٹریچر پر زیادہ تر اثر انہی کا پڑا ہے۔ اس قسم کی چیزیں عربوں سے پہلے سریانی لوگ یونانی زبان سے زیادہ تر عربی یا سریانی میں منتقل کر چکے تھے۔ اس کے بعد جو امثال و حکم عربی ذوق سے مناسبت رکھتی تھیں۔ انھیں عربوں نے اپنا لیا۔ چنانچہ عربی لٹریچر میں ایسی بہت سی حکم ملتی ہیں جو سقراط، افلاطون، ارسطو اور دیگر اربابِ علم و فلسفہ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض کی نسبت صحیح ہے اور بعض ایسی بھی ہیں جو ان کی طرف غلط طور پر منسوب کر دی گئی ہیں۔ حالانکہ وہ ان کے اقوال نہیں ہیں۔ مثلاً افلاطون کی طرف منسوب کر کے نقل کرتے ہیں کہ اس نے کہا تھا۔ "جب حکومت کا اقبال ہوتا ہے تو خواہشات عقل کے ماتحت رہ کر کام کرتی ہیں اور جب حکومت کا ادبار ہوتا ہے تو عقلیں خواہشات کی لونڈیاں بن جاتی ہیں:" یا مثلاً یہ قول جو افلاطون ہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ "علم کی بزرگی اور فضیلت یہ ہے کہ کوئی دوسرا شخص تمہاری طرف سے اس کی خدمت نہیں کر سکتا

---

[1] فقہ اللغۃ۔ ثعالبی

جیسا کہ باقی چیزوں میں کر سکتے ہے۔ بلکہ تمہیں خود ہی اس کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ پھر کوئی شخص تم سے علم کو چھین نہیں سکتا۔ جب کہ دوسری تمام چیزیں چھینی جا سکتی ہیں"۔ یا مثلاً یہ قول بھی جو اسی کی طرف منسوب ہے کہ "جو شخص اپنے ایک نفس پر کنٹرول نہیں کر سکتا وہ زیادہ چیزوں پر کب کنٹرول کر سکتا ہے"۔ یا ارسطو کا یہ قول کہ "امراء اور حکام سے زیادہ جبکہ وہ خود صالح ہوں لوگوں کو درست کرنیوالی کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی جب کہ وہ خود خراب ہوں تو ان سے بڑھ کر لوگوں کو خراب کرنیوالی کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ رعیت کے لیے حاکم ایسا ہی ہے جیسا کہ بدن کے لئے روح ہوتی ہے کہ بدن کی زندگی روح کے بغیر نہیں ہو سکتی"۔ یا ارسطو کا یہ قول کہ "وہ شخص کبھی سردار نہیں بن سکتا جو اپنے بھائیوں کے چھپے ہوئے عیبوں کی تاک میں لگا ہے"۔ یا سقراط کا یہ قول کہ "اچھی طبیعت کو تھوڑا سا ادب بھی کافی ہو جاتا ہے۔ لیکن شریر طبیعت کو زیادہ سے زیادہ ادب بھی کوئی فائدہ نہیں دے سکتا کیونکہ اس کی زمین ہی خراب (شور اور بنجر) ہوتی ہے"۔ نیز سقراط ہی کا یہ قول کہ "عقلیں خدا کا عطیہ ہیں اور علوم کسبی ہوتے ہیں"۔

ایک روایت ہے کہ ادمیردس کے پاس ایک آدمی آیا اور اس سے درخواست کی کہ میری ہجو میں کچھ لکھ دو تا کہ میں تمہاری ہجو سے فخر حاصل کر سکوں۔ کیونکہ میں اس لائق نہیں کہ تم میری مدح میں کچھ کہو۔ ادمیردس نے اس کی اس درخواست کو رد کر دیا اس پر اس آدمی نے دھمکی دی کہ میں یونان کے تمام رؤسا کے پاس جاؤں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ تم نے ہجو تک کرنے سے انکار کر دیا ہے تو ادمیردس نے فی البدیہہ کہا "ہم نے سنا ہے کہ جزیرۂ قبرص میں کسی کتے نے شیر سے جنگ کرنے کی ٹھانی۔ شیر نے اسے عار جانتے ہوئے اس کا مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا کتے نے اس سے کہا کہ میں تمام درندوں میں تمہاری اس کمزوری کا ڈھنڈورا پیٹوں گا۔ شیر نے جواب دیا کہ یہ بات کہ درندے تیرا مقابلہ کرنے سے انکار کر دینے پر مجھے عار دلائیں مجھے اس کی نسبت کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں اپنی مونچھیں تیرے خون سے ملوث کروں ...... الخ

یونانی حکم کا عربی زبان میں منتقل ہونا زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ جیسا کہ "ابن ہندو" نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ میں نے ایک رسالہ دیکھا ہے جو جواب میں طبع ہوا ہے اس رسالہ میں صرف وہ حکم جمع کی گئی ہیں جو افلاطون کی طرف منسوب ہیں۔ اس رسالہ کے مؤلف کا نام نہیں بتایا گیا البتہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ ایک قلمی نسخہ سے نقل کیا گیا ہے۔ جو ۹۱۳ھ کا لکھا ہوا ہے۔ بہر حال عربی لٹریچر کی کتابیں اس قسم کے امثال و حکم سے بھری پڑی ہیں۔

خلاصۂ مبحث

عربی عقلیت کی ایک خاص طبیعت تھی جو عرب کے محل وقوع اور مخصوص احوال و ظروف کا نتیجہ تھی۔ ان کی ایک خاص اجتماعی معیشت تھی جس کے مطابق زمانہ جاہلیت سے وہ زندگی بسر کرتے آ رہے تھے۔ دین اسلام کچھ جدید تعلیمات لے کر آیا اور اس نے زندگی کے لئے ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا جو اس نمونہ کے خلاف تھا جو جاہلی تقلیدات نے ان کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ اسلامی فتوحات نے ان کا دائرہ سلطنت ایران اور اس کے حوالی نیز رومی مستعمرات کے بیشتر حصہ تک وسیع کر دیا جس کے نتیجہ میں ایرانی دین، مدنیت اور علم اور ساتھ ہی

روحِ دین، مدنیت اور علم سب کے سب اسلامی مملکت کے اجزائے ترکیبی بن گئے۔ جس سے ایک مختلف العناصر ہیئت اجتماعیہ نے جنم لیا یہ تمام چیزیں جنہیں ہم شمار کر چکے ہیں ایسے مختلف اسباب و علل تھے۔ جن کے خود اپنے نتائج تھے۔ ان نتائج میں سے وہ حرکت علمی اور حرکت دینی بھی تھی جو اس عہد ——— یعنی وہ عہد جو دولت بنو امیہ کے اختتام کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے ——— میں پیدا ہوئی۔ اب ہمیں اس حرکت علمیہ اور حرکت دینیہ ہی سے گفتگو کرنی ہے۔ اختصار کے ساتھ ہم ان تمام اسباب کا بیان کر چکے ہیں جو اس حرکت کا موجب بنے۔ لہٰذا اب ہمیں مختصراً طریقے پر ان نتائج کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کر دینا چاہیے جو ان اسباب سے پیدا ہوئے۔ ان نتائج کو ہم دو حصوں میں تقسیم کریں گے۔ پہلے حصہ میں حرکت علمیہ کا بیان ہوگا اور دوسرے حصہ میں عقائد دینیہ کی حرکت کا بیان ہوگا۔

کیا آپ نے یہ کتابیں دیکھی ہیں؟

جشن نامے
ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشترات
سالہ دورِ آزادی کی رستی ہوئی تاریخ ۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسولؐ
یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کون سی ہیں، اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول ؟ - مزاج شناس رسول کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ قیمت چار روپے

مقامِ حدیث
حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جوابات۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات۔ قیمت فی جلد چار روپے۔

نوادرات از:- علامہ اسلم جیراجپوری
علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ
بڑا سائز ۴۰۰ صفحات قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت از:- پرویز
مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر پہلو قرآنی آئینہ میں
۱۹۲ صفحات قیمت دو روپے

قرآنی فیصلے
روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآنی روشنی میں بحث
۴۰۸ صفحات قیمت چار روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲/۱۵۹- ایل- پی- ای- سی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی ۲۹

DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
ڈوراجلوس
ناخون کی پالش
تزئین حسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
ڈوراجلوس
خوش رنگ - دیدہ زیب - چمکدار اور
خوشبودار پالش ہے۔
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے

قرآنی انقلاب کا لٹریچر

معراج انسانیت از:- پرویز
سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآنی آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم از:- پرویز
سلسلہ معارف القرآن کی پہلی جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصہ آدم جنات ملائکہ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۲۷۴ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

جوئے نور از:- پرویز
سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی جو حضرات انبیائے کرام کے تذکار جلیلہ پر مشتمل ہے۔ جس میں حضرت نوح سے لے کر حضرت شعیب تک تمام انبیائے کرام علیہم التحیۃ والسلام کا تذکرہ آگیا ہے۔
سائز ۲۹×۲۲/۸ ضخامت ۳۶۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

انسان نے کیا سوچا؟ از:- پرویز
فکر انسانی کی آج تک کی تاریخ کہ اس نے اپنی مشکلات و مسائل کے حل کرنے کے لئے آج تک کیا سوچا؟ محترم پرویز صاحب کی بلند پایہ تصنیف۔
سائز ۲۹×۲۲/۸ ضخامت ۳۶۸ صفحات قیمت دس روپے

سلیم کے نام از:- پرویز
نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ اور مدلل جواب بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے۔

فردوسِ گم گشتہ از:- پرویز
ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف ۴۱۶ صفحات قیمت چھ روپے

نظام ربوبیت از:- پرویز
انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دور حاضرہ کی عظیم کتاب بڑا سائز ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ قسم اول مجلد چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے

اسباب زوال امت از:- پرویز
(دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا؟ ضخامت ۱۷۲ صفحات قیمت دو روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳ ایل (پی۔ای۔سی۔ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

سب کی پسند
مسواک
ٹوتھ برش
ٹوتھ پیسٹ
MAKES
TEETH
PEARLY
WHITE

آپ نے کبھی سوچا؟
وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)
آپ رشک کر سکتی ہیں!
وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)
آپ کی صحت کا ضامن۔ امریکہ میں بنا ہوا ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔
بچے کو ان تمام خدشات سے محفوظ رکھنے کے لئے
وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب) خریدئیے

انڈس

خوبصورت اور پائیدار شیشہ کے برتنوں کا ضامن ہے

—— ہمارے ہاں ——

ہر قسم کے شیشہ کے ظروف، جگ، گلاس، برنیاں وغیرہ رنگین وسادہ منقش و پھولدار چمنیاں وگلوب بوتلیں واسٹیشنری اشیاء وبلاک گلاس تیار ہوتے ہیں۔

پتہ:- انڈس گلاس ورکس لمیٹڈ پوسٹ بکس ۵

گولیمار روڈ

حیدرآباد (مغربی پاکستان)

ملائم جلد اور دلکش نکھار کیلئے

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش
Hashmi
دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے
چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک
نایاب تحفہ ہے
جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور
جس کا استعمال ننھے بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ ہے